ڈاکٹر سردار احمد خاں :

میر سوز کے معاصرین اور ان کا تقابلی مطالعہ

بزرگ معاصرین :

۱۔ شاہ مبارک آبرو ..... ۱۱۱۰ ہجری مطابق ۱۶۹۸ ع تا ۱۱۶۳ ہجری مطابق ۱۷۵۰ ع

۲۔ مصطفےٰ خاں یکرنگ .....

۳۔ محمد شاکر ناجی ..... وفات ۱۱۶۸ ہجری مطابق ۱۷۵۴ ع

۴۔ نواب امیر خاں انجام ..... وفات ۱۱۹۵ ہجری مطابق ۱۷۴۷ ع

۵۔ سراج الدین علی خاں آرزو ... ۱۱۰۱ ہجری مطابق ۱۶۹۸ ع تا ۱۱۶۹ ہجری مطابق ۵۶-۱۷۵۵ ع

۶۔ ظہور الدین حاتم ..... ۱۱۱۰ ہجری مطابق ۱۶۹۸ ع تا ۱۱۹۸ ہجری مطابق ۱۷۸۳ ع

۷۔ محمد علی حشمت ..... متوفی ۱۱۶۲ ہجری مطابق ۱۷۳۸ ع

۸۔ میر سعادت علی خاں سعادت ....

۹۔ حضرت مظہر جان جاناں ..... ۱۱ / رمضان ۱۱۱۵۰ ہجری مطابق ۳۰ / جنوری ۱۷۰۳ ع تا ۱۰ / محرم ۱۱۹۵۰ ہجری مطابق ۶ / جنوری ۱۷۸۱۰ ع

ہم عمر معاصرین:

۱۰۔ مرزا محمد رفیع سودا ---------- ۱۱۲۵ ہجری مطابق ۱۷۱۳ع تا ۱۱۹۵ ہجری مطابق ۱۷۸۱ع

۱۱۔ میر عبدالحیٔ تاباں ---------- ۱۱۳۱ ہجری مطابق ۱۷۱۸ع تا ۱۱۹۹ ہجری مطابق ۱۷۵۰ع

۱۲۔ خواجہ میر درد ۱۱۳۲ ہجری مطابق ۱۷۱۹ع تا ۱۱۹۹ ہجری مطابق ۱۷۸۴ع

۱۳۔ میر تقی میر ۱۱۳۶ ہجری مطابق ۱۷۲۳ع تا ۱۲۲۵ ہجری مطابق ۱۸۱۰ع

۱۴۔ شیخ قیام الدین قائم ۱۱۳۹ ہجری مطابق ۱۷۲۶ع تا ۱۲۱۰ ہجری مطابق ۱۷۹۵ع

۱۵۔ انعام اللہ خاں یقین ۱۱۴۰ ہجری مطابق ۱۷۲۷ع تا ۱۱۶۹ ہجری مطابق ۱۷۵۶ع

۱۶۔ احسن اللہ بیان ۱۱۴۱ ہجری مطابق ۱۷۲۸ع تا ۱۲۱۳ ہجری مطابق ۱۷۹۸ع

۱۷۔ میر غلام حسن حسن ۱۱۴۱ ہجری مطابق ۱۷۲۸ع تا ۱۲۰۱ ہجری مطابق ۱۷۸۶ع

۱۸۔ اشرف علی خاں فغان ۱۱۴۲ ہجری مطابق ۱۷۲۹ع تا ۱۱۸۶ ہجری مطابق ۱۷۷۲ع

۱۹۔ جعفر علی حسرت وفات ۱۲۰۶ ہجری مطابق ۹۲-۱۷۹۱ع

کم عمر معاصرین:

۲۰۔ قلندر بخش جرأت ۱۱۴۹ ہجری مطابق ۱۷۳۶ع تا ۱۲۲۵ ہجری مطابق ۱۸۱۰ع

۲۱۔ شیخ غلام ہمدانی مصحفی ۱۱۶۳ ہجری مطابق ۱۷۵۰ع تا ۱۲۴۰ ہجری مطابق ۱۸۳۲ع

۲۲۔ میر انشاء اللہ خاں انشا ۱۱۶۷ ہجری مطابق ۱۷۵۳ع تا ۱۲۳۲ ہجری مطابق ۱۸۱۷ع

۲۳۔ سعادت یار خاں رنگیں ۱۱۶۹ ہجری مطابق ۱۷۵۵ع تا ۱۲۵۱ ہجری مطابق ۱۸۳۵ع

(اعتذار: سردست مذکورہ بالا خاکے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ مقالہ نگار نے میر سوز اور معاصرین کے تقابلی مطالعے کو شخصی حالات کے حوالوں اور ہمطرح غزلوں کی مدد سے پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے۔ اور اب ذیل میں میر سوز کے تلامذہ سے متعلق تفصیلات پیش کی جاتی ہیں۔ مدیر)

میر سوز کے تلامذہ

۱۔ آصف، نواب آصف الدولہ

۲۔ آشفتہ، حکیم رضا علی خاں

۳۔ امیر، نواب محمد یار خاں

۴۔ افسوس، میر شیر علی

۵۔ انور، محمد انوار الدین

۶۔ ترقی، محمد تقی خاں

۷۔ جان، جان عالم خاں

۸۔ حیف، موتی لال

۹۔ داغ، میر مہدی

۱۰۔ رند، نواب مہربان خاں

۱۱۔ سوزاں، شمس الدین

۱۲۔ طپاں، سید قدرت علی

۱۳۔ عیش، مرزا حسین رضائی

۱۴۔ عیاش، میر محمد یعقوب

۱۵۔ فریاد، لالہ صاحب رائے

۱۶۔ شوخ، گنا بیگم

۱۷۔ مدہوش، میر نبی خاں

۱۸۔ نوازش، نوازش حسین خاں

۱۹۔ ہوش، میر شمس الدین

مقلدین

۱۔ حیات، حیات اللہ

۲۔ زکا، مرزا محمد بخش

۳۔ سائل، جلیل شاہ

۴۔ میر کلو

۵۔ مشتاق، عبداللہ

۱۔ آصف، نواب آصف الدولہ:

نواب وزیر آصف الدولہ بہادر، یحییٰ خاں والی اودھ کے تخت نشیں ہونے سے پہلے سوز اودھ پہنچے اور سودا کی وفات کے بعد نواب وزیر آصف الدولہ کے کلام پر اصلاح دینے کی خدمت سنبھالی (۱)۔ نواب موصوف میر سوز کا بہت احترام کرتے تھے۔ یہ معلوم نہیں کہ انھوں نے استاد کا وظیفہ کیا مقرر کیا تھا لیکن نواب جب میر تقی میر کو تین سو روپیہ ماہوار وظیفہ دیتے تھے تو استاد ہونے کے لحاظ سے ان کے ساتھ خصوصی مراعات ہوں گی۔ میر سوز اس منصب پر سولہ سترہ سال فائز رہے۔ آصف الدولہ نے ۲۸ ربیع الاول ۱۲۱۲ہجری مطابق ۱۷۹۷ء میں اکیاون سال کی عمر میں وفات پائی۔

آصف کے کلام میں سوز کی جملہ خصوصیات ملتی ہیں۔ سادگی، صفائی اور اثر آفرینی جو سوز کے ہاں ہے وہی آصف کے ہاں بھی موجود ہے (۲)۔ نیاز فتح پوری جو یہ تسلیم نہیں کرتے کہ سوز سے آصف مشورہ سخن کرتے تھے، یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ان کے کلام میں سوز کی خصوصیات ضرور پائی جاتی ہیں (۳)۔

نمونۂ کلام:

۱۔ جو شمشیر (۴) ان کی علم دیکھتے ہیں — وہیں سر کو اپنے قلم دیکھتے ہیں
۲۔ جو جلوہ صنم تجھ میں ہم دیکھتے ہیں — خدا کی خدائی میں ہم دیکھتے ہیں
۳۔ شتابی سے آ ورنہ میرے مسیحا — کوئی دم میں راہ عدم دیکھتے ہیں
۴۔ ملے تم ہو میرے رقیبوں سے جا کر — ہمیں ہیں کہ سو سو ستم دیکھتے ہیں
۵۔ خدا دشمنوں کو نہ وہ دکھ دکھائے — جو کچھ دوست اپنے سے ہم دیکھتے ہیں
۶۔ بہت جھوٹے وعدے کیے تونے ہم سے — بھلا ہم تو تیری قسم دیکھتے ہیں
۷۔ تو آوے نہ آوے میاں ہم تو ہر شب — پڑے راستہ صبح دم دیکھتے ہیں
۸۔ بتوں کی گلی میں شب و روز آصف — تماشا خدائی کا ہم دیکھتے ہیں

جس گھڑی تیرے آستاں سے گئے — ہم نے جانا کہ دو جہاں سے گئے
تیرے کوچے میں نقشِ پا کی طرح — ایسے بیٹھے کہ پھر نہ واں سے گئے

شعلے کی طرح رفتہ رفتہ ہم — سنیو اک دن کہ جسم و جاں سے گئے
عشق ہاتھوں سے تیرے کیا کہیے — نام سے گذرے اور نشاں سے گئے
ایک دن ہم نے یار سے جو کہا — اب تو ہم طاقت و تواں سے گئے
ہنس کے بولے کہ سنتا ہے آصف — یوں ہی کہہ کہہ کے لاکھوں یاں سے گئے

یہ اشک چشموں میں ہم دم رہے رہے نہ رہے — حباب وار کوئی دم رہے رہے نہ رہے
تو اپنے شیوۂ جور و جفا سے مت گذرے — تری بلا سے مرا دم رہے رہے نہ رہے
قمر کو ہوتا ہے ہر ماہ میں کمال و زوال — ترے یہ حُسن کا عالم رہے رہے نہ رہے
عرق ہے رخ پہ ترے خوش نما صنم لیکن — ہمیشہ گل پہ یہ شبنم رہے رہے نہ رہے
یہ تیرے وصل و جدائی کا کیا لکھے آصف — یہ اتفاق ہے باہم رہے رہے نہ رہے

مرے دل کو زلفوں میں زنجیر کیجو — یہ دیوانہ اپنا ہے تدبیر کیجو
مرے دل نے زلفوں میں مسکن کیا ہے — یہ مہماں ہے اے شانہ توقیر کیجو

دل ہمارا خانۂ اللہ کر مشہور تھا — سو بتوں کے عشق میں اب وہ بھی بتخانہ ہوا

اے پری نام خدا تیری سجاوٹ خاصی — قہر چھب تس پہ یہ انگیا کی کساوٹ خاصی
سر کے تعویذ ستم اور فتح بیچ غضب — بال مہکے ہوئے چوٹی کی گندھاوٹ خاصی
پہنچیاں واچھڑے اور کان کی بالی بیداد — نورتن ایسی ہی گہنے کی جراوٹ خاصی
گوکھرو دیکھ کے لہرائے یہ دل کہتا ہے — گوکھرو اور بنت کی ہے بناوٹ خاصی
سب سے پوشاک جدی سب سے نرالا تک سک — دانت تصویر ہے مسی کی اراوٹ خاصی
کفش پاؤں میں بھبھوکا ہے مغرق نادر — اس پہ کافر یہ پجامے کی چاوٹ[؟] خاصی
بند پاجامے میں چمکے ہے ثریا کی جھلک — ہے پری زاد کھڑی اور بناوٹ خاصی
قطعہ چولی کا ستم گھیر بھی دامن کا غضب — آستیں چست بہت اور چناوٹ خاصی

گر جگت بولے تو بولے کی ... ہو زبان　　اور جو رک جاوے تو رکنے کی رکاوٹ خاصی
کیوں نہ ایسے سے پھنسے دل بھلا انصاف کرو　　گفتگو سحر کمر خوب لگاوٹ خاصی

کیا کیا اظہار میں تم سے کروں اس کا آصف
دست و پا خوب ہیں مہندی کی رچاوٹ خاصی

نواب بیگم کے جواب میں یہ غزل خوب ہے :۔ (۵)

خوشی دل میں ہم اپنے کم دیکھتے ہیں　　اگر دیکھتے ہیں تو غم دیکھتے ہیں
نہ قطرہ کوئی خوں کا باقی ہے دل میں　　نہ آنکھوں میں ہم اپنی نم دیکھتے ہیں
تو آوے نہ آوے یہاں ہم تو ہر شب　　پڑے راہ تا صبح دم دیکھتے ہیں
نگاہ کرم جس جگہ پر کرے تو　　ہم اس جا پہ باغ ارم دیکھتے ہیں
کرم سے ترے شاد خرم ہیں یہ سب　　مگر ایک ہم ہیں کہ غم دیکھتے ہیں
زیادہ ہو یعقوب سے غم ہمارا　　جو ہم تجھ کو یوسف سے کم دیکھتے ہیں
تبسم بلب ہیں تمامی یہ ہمدم　　ہم اپنی ہی آنکھوں میں نم دیکھتے ہیں
بہت جھوٹے وعدے کئے تو نے ہم سے　　بھلا اب کے تیری قسم دیکھتے ہیں
کہاں تاب ہے غیر کو دیکھنے کی　　اگر دیکھتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں
کہا ہے جو تم نے یہ اپنی غزل میں　　تماشا خدائی کا ہم دیکھتے ہیں
وہی دیکھتا ہے جو دیکھے ہے سب کچھ　　نہ تم دیکھتے ہو نہ ہم دیکھتے ہیں

تجھ سا دلدار ہو اور ناز خرام ایسا ہو　　کیوں کہ دل کفر سے منکر ہو جو رام ایسا ہو
میں ترے صدقے ہوں اور گالیاں تو دے ظالم　　بندگی ایسی ہو اور اس کا انعام ایسا ہو
زلف مشکیں میں پری رو کے یہ دل کیوں نہ پھنسے　　ایسا صیاد ہو اور ہاتھ میں دام ایسا ہو
ملتجی مت ہو سوا ذات علی کے آصف　　پھر تجھے چاہیے کیا جس کا امام ایسا ہو

۲۔ آشفتہ، حکیم رضا قلی خاں :

نام حکیم رضا قلی خاں اور والد کا نام حکیم محمد شفیع خاں تھا۔ وطن اکبر آباد تھا۔ ان کے بڑے بھائی کا نام مرزا جو تھا ذرہ تخلص کرتے تھے۔ زیارت کے لیے کربلا گئے اور وہیں پیوند خاک ہوئے۔ دوسرے بڑے بھائی کا نام مرزا رضی تھا۔ وہ لکھنؤ میں طبابت کرتے تھے۔ فن طبابت میں اس خاندان کو بہت شہرت حاصل تھی۔ سلاطین امرا اور وزرا ہمیشہ قدر دانی کرتے رہے، خود آشفتہ کا شمار حاذق طبیبوں میں ہوتا تھا۔ علی لطف ان کو اپنے قدیمی دوستوں میں شمار کرتے ہیں اور ان کو آزاد وضع، خود اختلاط، وارستہ مزاج اور مایہ ارتباط محبت و یکرنگی قرار دیتے ہیں (۶)۔ آشفتہ دو ڈھائی برس فیض آباد میں مرزا یوسف کور کے پوتے مرزا محمد تقی خاں کی رفاقت میں رہے۔ بعد میں مستقلاً لکھنؤ میں رہنے لگے۔ ۱۲۰۸ہجری مطابق ۹۴-۱۷۹۳ع میں لکھنؤ سے مرشد آباد آئے۔ نوب مبارک الدولہ ناظم صوبہ بنگال مرض الموت میں گرفتار تھے۔ آشفتہ نے ان کا علاج کیا لیکن شفا نہ ہوئی مبارک الدولہ کے مرنے کے بعد ان کے بیٹے نواب صدر الدولہ ناصر الملک سید میر علی خان دلیر جنگ کے پاس ایک سال تک رہے۔ مرشد آباد میں آشفتہ نے نہایت فراغت سے زندگی بسر کی علی لطف لکھتے ہیں کہ بنگال میں انھوں نے ایک لاکھ روپیہ پیدا کیے آشفتہ بہت کشادہ دست تھے (۷)۔ ذی الحجہ ۱۲۱۴ہجری مطابق ۱۷۹۹ع میں آشفتہ مرشد آباد سے کلکتہ چلے گئے۔ علی لطف کہتے ہیں کہ بالفعل کہ ۱۲۱۵ہجری مطابق ۱۸۰۰ع ہے بہ عزت تمام کلکتہ میں بسر اوقات کرتے ہیں۔ شاہ کمال کہتے ہیں کہ فقیر سے بہت ملاقات تھی اور آشفتہ کے مکان پر مشاعرے منعقد ہوتے تھے۔ (۸)

علی لطف (۹)، مصحفی (۱۰) اور احمد علی یکتا (۱۱) کا قول ہے کہ سوز کے شاگردوں میں کوئی دوسرا یہ مقام حاصل نہ کرسکا۔ وہ شعر گوئی اور شعر خوانی میں میر سوز کی کامل اتباع کرتے تھے۔ اور اس بات پر فخر بھی کرتے تھے۔ شعر درد آمیز، صاف اور شستہ کہتے تھے۔ اشعار پڑھنے کا انداز بالکل میر سوز کی طرح تھا۔ وہ اپنے استاد کی طرح حرکات و سکنات کے ذریعے اشعار کی وضاحت کرتے تھے۔ انھیں فن موسیقی سے بہت لگاؤ تھا۔ مصحفی کہتے ہیں کہ ۱۱۹۸ہجری مطابق ۸۴-۱۷۸۳ع میں جب وہ لکھنؤ پہنچے تو آشفتہ نے طرحی مشاعروں کا بندوبست کیا۔ وہ اپنے مکان پر مشاعرے منعقد کرتے تھے۔ آزاد مزاجی کے باعث انھوں نے اپنے اشعار کو محفوظ نہیں رکھا۔ اسی وجہ سے دیوان مرتب نہ ہوسکا۔ شروع میں حکیم تخلص کرتے تھے بعد میں آشفتہ اختیار کیا۔ (۱۲)

مرزا سعادت یار خاں رنگین اپنی مجلس پنجاہ و سوم میں آشفتہ سے اپنی ایک ملاقات کا

ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مرشد آباد میں حکیم رضا قلی متخلص بہ حکیم کے مکان پر میرا جانا ہوا۔ محمد خاں صاحب بھی میرے ہمراہ تھے۔ حکیم صاحب میر سوز کے شاگرد ہیں۔ میر موصوف کے اشعار کا تذکرہ ہونے لگا۔ ان کی تعریف میں اس قدر مبالغہ کیا کہ فرمایا کہ ان کی بول چال کے برابر کسی میں یہ خوبی کلام ہرگز ہرگز نہیں پائی جاتی۔ حاضرین میں سے ایک شخص بولا کہ یہ صاحب سوز کے کلام پر کچھ اعتراض رکھتے ہیں۔ میں نے کہا ہاں۔ اس پر حکیم صاحب بہت بھنائے۔ اور اپنے استاد کا ایک قطعہ پڑھ کر کہا کہ اچھا اس میں کوئی نقص نکالیے میں نے کہا کہ یہ کیا ضرور ہے کہ کسی بزرگ کی شان میں مجھ سے گستاخی واقع ہو لیکن جب بہت اصرار کیا تو میر سوز کا وہ قطعہ مجھے پڑھ کر سنایا"۔

میں کہا دل میں درد ہے میرے ہنس کے کہنے لگا خدا نہ کرے۔
پھر جو کچھ جی میں آ گیا تو کہا ہمیں پیٹے اگر دوا نہ کرے

میں نے کہا کہ اول مصرع میں "کہا" غیر فصیح ہے اور دوسرے مصرع میں یہ نہیں کھلتا کہ کون ہنسا اور کس نے کہا۔ ہنس کے کہنے لگا خدا نہ کرے۔ "اگرچہ اس میں اشارہ معشوق کی طرف ہے لیکن زیادہ واضح نہیں ہوسکا اور "پھر جو کچھ جی میں آگیا تو کہا" اس میں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کس کے جی میں آیا اور چوتھے مصرع میں "پیٹے" کا لفظ عورتوں کی زبان کے لیے مخصوص ہے، مرد اس کو شعر میں نہیں لایا کرتے غرض دوسرے روز پھر گیا اور میں نے اپنے کچھ قطعے سنائے جو سب کو پسند آئے"۔ (۱۳)

روٹھ کر میں جو اٹھ چلا رنگیں ہو کے وہ بے قرار دوڑے آے
لگ کے چھاتی سے پھر لگے کہنے ہمیں ہے ہے کرے جو آگے جاے

میں نے پوچھا کہ جانتے ہو مجھے بولے "رنگیں کو ہم تو بھول گئے"
اس کے منہ سے یہ بات سنتے ہی بس مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے

رنگین کے اعتراض سے بحث سوز کے کلام کے تنقیدی مطالعے کے ذیل میں آئے گی۔ اس لیے یہاں پر ہم اس مسئلے کو نظر انداز کرتے ہیں۔ اور آشفتہ کا نمونہ کلام درج کیا جاتا ہے۔

جی تھا آنکھوں میں ، یار تھا دل میں　　یاں تلک انتظار تھا دل میں
آبلہ ہوکے دم میں پھوٹ بہا　　یہ کہاں کا بخار تھا دل میں
مر گئے پھر بھی ہم کو خاک نہ دی　　آج تک یہ غبار تھا دل میں
کھینچتے ہی تک آسے کمان ابرو　　تیر مژگان دو سار تھا دل میں
دم آخر جو ہچکی آئی تھی　　وہ فراموش خار تھا دل میں
دست و لب نزع میں جو ہلتے تھے　　شوق بوس و کنار تھا دل میں

دم شماری تلک بھی آشفتہ
قدموں کا شمار تھا دل میں

فقط نہ اپنی ہی تم آن دیکھتے جاؤ　　ادھر ادھر بھی مری جان دیکھتے جاؤ
نہ پیچ و تاب کو بالوں کے طول دو اتنا　　ہمارا دل ہے پریشان دیکھتے جاؤ
بجائے اشک نکلتے ہیں پارہ ہائے جگر　　تمھارے جی میں تھا ارمان دیکھتے جاؤ
دکھانے آئے تھے دامن کے چاک کی خوبی　　ہمارا چاک گریبان دیکھتے جاؤ
کیا خرید زلیخا نے مصر میں یوسف　　جناب عشق کی تم شان دیکھتے جاؤ
اگرچہ ہووے گی تصدیع لیکن آشفتہ　　کوئی گھڑی کا ہے مہمان دیکھتے جاؤ

چلا ہے کعبہ کو آشفتہ پارسا بن کر　　خدا جو بیٹھے بٹھائے اسے خراب کرے
وصل اس کا خدا نصیب کرے　　دیکھیں تب ہم سے کیا رقیب کرے
ہر سے قتل وصل سے احیا　　حب میں جو آوے سو جیب کرے
گل کا دیکھا چٹک کے جب ہنسنا　　شور کیوں کر نہ عندلیب کرے
مر گیا اک صنم پہ آشفتہ　　موت ایسی خدا نصیب کرے

یہ خرابی تو پڑی مجھ پہ ترے جانے سے　　چند بھی ڈرنے لگے اب مرے ویرانے سے
کس طرح قید کروں یہ تو ٹھہرتا ہی نہیں　　کون بر آوے بھلا اس دل دیوانے سے

میں سمجھتا ہوں کہ تم جاکے نہیں آنے کے
فائدہ کیا ہے بھلا جھوٹ قسم کھانے سے
شعلہ خو آگے تو اتنا نہ جلاتا تھا مجھے
آج تو آگ ہوا غیروں کے بھڑکانے سے

دیکھتے ہی اسے کل میرے یہ اوسان گئے
اپنے بیگانے وہاں جتنے تھے سب جان گئے
اپنے کے ہوتے بھلا غیر کو صدقے تو نہ کر
ہم بھی جی رکھتے ہیں پیارے ترے قربان گئے

مجھ کو کہنا ہے صنم تجھ کو بھی اب بھاگ لگے
آنکھ سے آنکھ ملاتا ہے تجھے آگ لگے
بوسے کے واسطے چمٹا تو لگا کہنے مجھے
بس کہیں دور بھی ہو منہ کو ترے آگ لگے

وہ رشک مہر جو عالم میں بے نقاب پھرے
پھر اس چمک سے نہ گردوں پہ آفتاب پھرے
گئے تھے کل مجھے بہلا کے "میں یہ آتا ہوں"
میں ایسے آنے کے صدقے بہت شتاب پھرے

لڑتے تو رات اس سے میں غصہ میں لڑلیا
پر جب وہ اٹھ چلا تو کلیجہ پکڑ لیا
یہ جوشِ غم ہے کہ سینے میں خوں ابلتا ہے
نہ رکھیو ہاتھ کلیجے پہ میرے جلتا ہے
نہ پوچھو دل کی حقیقت تمہارے عشق میں آہ
اسے وہ غم جو لگا ہے اسی میں گھلتا ہے
یہ ہم کو اس کی جدائی نے اور ایذا دی
کہ رات کوئی یہ سینے میں دل کو ملتا ہے
کسی کے کان کا دُر تونے دیکھا آشفتہ
جو اشک آنکھوں سے موتی سا تیرے ڈھلتا ہے

ہمیشہ آگ نکلتی ہے میرے سینے سے
الٰہی موت دے گذرا میں ایسے جینے سے
نہ جاوے کیوں کہ بصارت وہ چاند سا مکھڑا
نظر پڑا نہیں مجھ کو کئی مہینے سے
ہو جس دماغ میں کچھ بوئے عشق وہ سمجھے
ملی جلی ہوئی بو عطر کی پسینے سے

چہرہ کچھ ان دنوں غم پنہاں سے زرد ہے
ظاہر میں کچھ مرض نہیں پر دل میں درد ہے

سانس آ کر جگر میں اڑتی ہے
شکل جب تیری یاد پڑتی ہے

یاں نہ ہم مارے جائیں کیوں کہ بھلا کیا بری طرح آنکھ لڑتی ہے
بیچ میں لا کے ہم غریبوں کو زلف کس کس طرح اکڑتی ہے
تجھ کو جانے دوں کیوں کہ خانہ خراب دل کی بستی مری اجڑتی ہے
پچھلے مردے اکھیڑو مت آو نعش آشفتہ آج گڑتی ہے

۳۔ امیر، نواب محمد یار خاں:

کریم الدین لکھتے ہیں :۔ (۱۴)

"اس نے میر سوز اور مرزا محمد رفیع سودا سے جو کہ ان ایام میں درمیان فرخ آباد کے مہربان خاں کے ہمراہ رہتے تھے اصلاح لینی شروع کی۔ ہر چند اس نے ان دونوں شاعروں سے درخواست کی کہ تم میرے پاس چلے آؤ انھوں نے نہ مانا"۔

قائم کے ٹانڈے پہنچنے سے پہلے امیر، سوز اور سودا ہی سے اصلاح لیتے ہوں گے۔ قائم کی آمد کے بعد ممکن ہے یہ سلسلہ منقطع ہوگیا ہو۔ ہوسکتا ہے کہ سوز جب ٹانڈے پہنچے ہوں تو مختصر عرصے کے لیے اصلاح کا سلسلہ بھی جاری ہوگیا ہوگا۔ لیکن اس کی مدت چند ماہ سے زیادہ نہیں ہوسکتی۔

نمونۂ کلام:

تیرے گھر جانے سے یاں اپنا تو گھر جاتا ہے اے مری جان کے دشمن تو کدھر جاتا ہے
واہ ری سرخی ترے چہرے کی ہنگام عتاب جتنا بگڑے ہے تو اتنا ہی سنور جاتا ہے

تھرتھرانا ہے اب تلک خورشید سامنے تیرے آگیا ہوگا (۱۵)

اس شکار انداز سے لگ کر کوئی چھوٹے ہے آنکھ کیوں نہ ہو سوے قضا منہ وقت رم نخچیر کا

بس میں آیا جو تمھارے اسے چاہو سو کرو کیا ستم آدمی سہتا نہیں لاچاری سے

۴۔ افسوس، میر شیر علی:

اردو کے مشہور نثر نگار اور فورٹ ولیم کالج کے نورتن میر شیر علی افسوس ۱۱۵۳ہجری مطابق ۱۷۴۰ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے باپ کا نام میر مظفر خاں تھا۔ نارنول کے رہنے والے تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب امام جعفر صادق سے ملتا ہے۔ میر مظفر خاں نواب قاسم خاں عالی جاہ کے داروغہ توپخانہ تھے (۱۶)۔ جب نواب میر قاسم عالی جاہ کو انگریزوں کے مقابلے میں شکست ہوئی تو میر مظفر خاں لکھنؤ چلے آئے۔ اس وقت میر شیر علی کی عمر گیارہ سال تھی۔ میر شیر علی تقریباً گیارہ سال نواب حسین علی خان سالار جنگ اور ان کے لڑکے مرزا نوازش علی خاں کے پاس رہے۔ نواب حسین علی خاں نواب قاسم علی خاں عالی جاہ کے داماد تھے اس وجہ سے میر مظفر جنگ سے ان کے خصوصی مراسم تھے (۱۷)۔ میر شیر علی افسوس کو مختلف تذکرہ نگاروں نے مختلف استادوں کا شاگرد لکھا ہے (۱۸)۔ سید علی حسن خان (۱۹) نے ان کو میر حیدر علی حیراں اور میر سوز کا شاگرد بتایا ہے۔ مصحفی کہتے ہیں کہ پہلے میر سوز سے تلمذ تھا پھر حیراں سے استفادۂ سخن کیا (۱۹)۔ لطف نے ان کو میر حسن کا شاگرد لکھا ہے (۲۱)۔ میر حسن کی اپنی روایت یہ ہے کہ کچھ عرصہ میر سوز سے فائدہ اٹھایا پھر آگے مزید اضافہ کرتے ہیں:

"با فقیر از سبب ہم نشینی صحبت شعراء اکثر می شود۔ ہر سخنے کہ می گویم از رہ منصفی درست می داند"۔ (۲۲)

بعض کا قول ہے کہ میر سوز اور میر تقی میر سے اصلاح لی تھی۔ (۲۳)

احمد علی یکتا رقم طراز ہیں:

"معلومات میں اور بندش سخن میں کسی طرح بھی ہم عصروں سے کم نہ تھا۔ صاحب دیوان ہوا۔ اکثر اقسام شعر کو اچھا کہا۔ پہلے میر سوز کی شاگردی کی آخر میں میر حیدر علی حیراں سے رجوع کیا۔ مشق کلام پختگی تک پہنچائی۔ فقیر سے بہت دوستی اور اتحاد تھا۔ حکیم آغا محمد باقر صاحب کی خدمت میں مدتوں ہم دونوں شریک درس رہے آخر مرزا فخر الدین احمد خاں مرحوم کی سفارش سے کمپنی میں بصیغۂ شاعری اور اردو دانی نوکر ہو کر مدتوں کلکتہ رہے اور وہیں ۱۲۲۴ ہجری مطابق ۱۸۰۹ء میں انتقال کیا (۲۴)۔ یہ اس کی تاریخ وفات ہے:۔

از جہاں رفت میر شیر علی کرد ہر پیر و ہر جواں افسوس
بود افسوس چون تخلص او ہمہ کردند شاعراں افسوس
گفتم از روئے درد این تاریخ رفت افسوس زین جہاں افسوس
(۱۲۲۴)

فورٹ ولیم کالج کے تراجم میں ان کی باغ اردو (ترجمہ گلستان) اور آرائش محفل مشہور ہے۔ (۲۴)

نمونۂ کلام:

قفس سے چھٹنے کی امید ہی نہیں افسوس حصول کیا ہے جو مژدہ بہار کا پہنچے

کوئی دل سے مرے پوچھے جیسا ہے وہ اے ناصح گو تجھ کو نہ خوش آیا پر مجھ کو تو بھاتا ہے

کیا لکھوں اس کو میں احوال یہ کہنا قاصد بے حواسی کے سبب طاقت تحریر نہیں

کوچۂ یار میں رہتے تو نہیں اب لیکن بھولے بھٹکے کبھی اس راہ سے ہوجاتے ہیں

دیکھتے ہی اسے حاضر ہوئے مرجانے کو وہی غم خوار جو یاں آئے تھے سمجھانے کو

پھر بھر ہے وہی ، وہی دن ہے پہاڑ سا وصل صنم تو رات کو اک خواب ہوگیا

کچھ بات تم سے کر نہیں سکتے ہزار حیف مدت میں تم ملے بھی تو غیروں کے گھر ملے

ہنس کر مجھے لوگوں میں اشارات نہ کیجے رسوائی ہو جس بات میں وہ بات نہ کیجے

اشک گرم اپنے سے یہ دیدہ تر جلتے ہیں دیکھ لو مردم آبی کے بھی گھر جلتے ہیں

سچ ہیں یہ خود نمائیاں حق ہیں یہ لن ترانیاں
شعلہ طور بجھ گیا دیکھ کے اس کے نور کو
تونے فسوس کیا کیا دشمن جاں کو دل دیا
یہ تری عقل جل بجھی آگ لگے شعور کو

صبح نت کرتا ہے یہ دل اشکباری بیشتر ہو سحر کو خانہ ماتم میں زاری بیشتر

دل کے تئیں بھی آشنائی کا نہیں کچھ اعتبار بے وفاؤں سے رہی ہے تجھ کو یاری بیشتر

یہ ملک دل تو جل کے سراسر بھسم ہوا — سوز جگر مگر نہ ذرا اب بھی کم ہوا
تسکین جی کو کب ہوئی اک دم وصال سے — بلکہ دو چند آگے سے اس دل کے غم ہوا
اے شیخ جا تو کعبہ کو معذور رکھ مجھے — بیت الصنم ہی مجھ کو تو بیت الحرم ہوا
اے دل لگا تو مانگنے اب موت دم بہ دم — افسوس تجھ کو ہجر کا ایسا الم ہوا

کرنے نہ دیا اک تری آنکھوں کا نظارا — اس تیر نظر نے تو مجھے مفت میں مارا
سب بھول چلے رشک سے بلبل کے اڑے ہوش — جامہ جو ذرا باغ میں اس گل نے اتارا
وہ شب بھی گئی مفت میں اس مہ نے سحر کی — جوڑے کو بنایا کبھی زلفوں کو سنوارا
اس تیرے بنا گوش کے موتی کی چمک کے — قربان فلک نے بھی کیا صبح کا تارا
گھبرا کے دوانوں کی طرح دوڑ پڑا میں — اے مہ جو کسی اور کو بھی تونے پکارا
خوباں کو لگا ناز سے دینے جو تو خلعت — گل نے بھی ترے سامنے دامن کو پسارا
میں نے جو ترے واسطے اپنوں کو بھی چھوڑا — اغیار سے لیکن نہ کیا تو نے کنارا
اس شخص کے باعث سے ہوئے سیکڑوں دشمن — صد حیف کہ وہ بھی نہ ہوا دوست ہمارا
اب صاحب عالم کی ثنا میں تو غزل کہہ — افسوس نہ کر شکوۂ دلدار خدارا

اے ماہ نہاں شب کو تو کس گھر میں نہاں تھا — جو تیرہ مری نظروں میں سارا یہ جہاں تھا
وہ ناز سے تھا جلوہ کناں میں نگراں تھا — واللہ وہ کیا وقت تھا اور کیا وہ سماں تھا
اب کون سی صورت ہے مری زیست کی ہم دم — یوں روٹھ چلا جو کہ مرا مونس جاں تھا
تھا دل کو قلق تیرے نہ آنے سے نہایت — یہ دیر لگی کس لیے اب تک تو کہاں تھا
اب ٹھوکریں کھاتا ہے تری اور نہیں ہلتا — وہ دل جو نظر کردۂ اہل نظراں تھا
سو داغ اگر ہیں تو عجب کیا ہے کہ یہ دل — اک عمر تلک شیفتۂ لالہ رخاں تھا
جس دل کے تئیں دیکھتے ہو دشت سا ویراں — اے دوستو آباد کبھو یہ بھی مکاں تھا

ہم دم تجھے معلوم نہیں ہو تو یہ سن لے — اس واسطے اس کوچے میں کل شور و فغاں تھا
افسوس کے تئیں قتل کرے تھا وہ ستم گر — اک طائفۂ غمزدگاں گریہ کناں تھا

ہے حماقت اب جو کیجے جور کا تیرے گلہ — ہاں میاں اپنے ہی پیش آیا ہے یہ اپنا کیا
بے مروت بے وفا بے رحم کا عاشق ہوا — کیوں نہ مارا جاؤں میں کاہے کو میں ایسا کیا
دیدۂ پرخوں نے تیرے آہ رو رو خون دل — ایک دم میں لال سارا دامن صحرا کیا
اے بت پیماں شکن اب تک نہ آیا تو ادھر — صبح سے تا شام تیری راہ میں دیکھا کیا
ایک دن مجھ سے نہ پوچھا کس لیے روتا ہے تو — غیر کے آنسو سدا دامن سے تو پونچھا کیا
سنگ دل خونی ستم گر کی نگاہ گرم پر — دل حوالے کر دیا افسوس تو نے کیا کیا

جنت سے کہیں بہتر ہے یار ترا کوچہ — چھوڑیں نہ کبھی ہم تو زنہار ترا کوچہ
آیا نہ نظر شاید تو اس لیے میں جاکر — دیکھ آتا ہوں اک دن میں سو بار ترا کوچہ
اس طرح ہمیں پیارے کیا دور اٹھا پھینکا — یوں چھوٹ گیا ہے ہے اکبار ترا کوچہ
اس میں جو کوئی آیا وہ جا نہ سکا ہرگز — کیا پاؤں پکڑتا ہے دلدار ترا کوچہ
طاقت گئی پاؤں کی دشوار ہوا چلنا (ق) — افسوس نے گھر جانا جب یار ترا کوچہ
تب اس نے مقرر ہی رہنے کو کیا اپنے — جوں نقش قدم آخر ناچار ترا کوچہ

اگرچہ باغ و چمن کی بہار ہے غنچہ — پہ تو نہ ہووے تو نظروں میں خار ہے غنچہ
لگی ہے تیغ نگہ کس کی یہ بتا بلبل — کہ ٹکڑے ہے جگر گل فگار ہے غنچہ
جلے ہے اس لیے دل بلبلوں کا اے گلرو — کہ تیرے مکھڑے پہ جیسے نثار ہے غنچہ
ترے لبوں سے جو تشبیہ دیجئے تو غلط — یوں اپنی آن میں رنگیں ہزار ہے غنچہ
ہنسا ہے تو مگر اس کے دہن پہ اے گلرو — کہ منفعل بسر شاخسار ہے غنچہ
ضرور کیا ہے جو گلشن میں جائیں چھوڑ تجھے — ترا ہی منہ ہمیں اے گلعذار ہے غنچہ

تو اس کا بوسہ جو لیتا ہے دم بہ دم افسوس کسی دہن کا مگر یادگار ہے غنچہ

شب وصل روز فراق کی مجھے سدھ نہ ایک ذری رہی
مے عشق کا یہ نشہ چڑھا کہ مدام بے خبری رہی
کوئی کھیت ہوئے جہان میں دیے پانی بن نہ ہرا ہو تک
مگر اپنی کشت مراد کی وہی آگ ہے جو ہری رہی
ہے اگر تجھے طلب ثمر تو کبھی ادھر کا نہ دھیان کر
وہ شجر ہوں میں ہی جہان میں جسے نت ہی بے ثمری رہی
نہ فقط تری سر راہ پر یہ لگے ہیں آدمیوں کے ٹھٹ
تجھے دیکھا چلتے جو ناز سے تو کھڑی ہی کبکِ دری رہی
بھویں اپنی ناز سے تک چڑھا جوں ہی آن کر وہ کھڑا ہوا
نہ تو حور کر سکی سامنا نہ مقابل اس کے پری رہی
تن زار سے مرے جب تلک دم واپسیں نہ نکل گیا
تری تیغ اے بت جنگجو مرے حلق پر ہی دھری رہی
نہ چھٹا کہیں سے بھی اک ذری اسے دھوتے دھوتے تھکے سبھی
تری تیغ خون فسوس سے جو بھری تھی سو ہی بھری رہی

آخر الامر بے وفائی ہے تیری دو دن کی آشنائی ہے
کون آتا ہے جی کے لینے کو پیشوا جان لب تک آئی ہے
روز محشر تلک جو صبح نہ ہو سو وہ یارو شب جدائی ہے
عشوہ و ناز غمزہ سب ہیں جمع مجھ پہ اک فوج کی چڑھائی ہے
جب بلاتا ہوں ہنس کے کہتا ہے میں نے مہندی ابھی لگائی ہے
دیکھ کر اس کی مسی میں نے کہا (ق) وا چڑے کیا دھڑی جمائی ہے
مسکرا کر کہا تب اس نے یوں تیری افسوس موت آئی ہے

شب و روز بزم نشاط میں وہ صنم تو مست شراب ہے
مرے دل کی اس کو خبر نہیں کہ یہ سوز غم سے کباب ہے

غم و درد سے ہوں میں نیم جاں مجھے زیست سخت عذاب ہے
مرے قتل میں تو نہ دیر کر بخدا یہ کار ثواب ہے

سخن عاشقوں کا بھی سن ذرا ادھر اور ادھر تو کہیں نہ جا
دل غم زدہ کو پھر آ بسا ترے بن یہ ملک خراب ہے

مجھے کیا غرض ہے کہ جاؤں میں کسی میکدے میں برائے مے
تری چشم مست کی اک نظر مرے واسطے مئے ناب ہے

یہ ہے سوچ جو کبھی آئے وہ تو کہاں بٹھاؤں کہ ان دنوں
مرا دل جو ہے سو وہ خون ہے مری چشم ہے سو وہ آب ہے

ترے بال مشک ختن سے ہیں لب لعل تیرے ہیں غنچہ ساں
ترا جسم گل ہے بسانِ گل ، عرق اس کا مثلِ گلاب ہے

جسے دیکھتے ہی جنون ہو ، جسے ترک عشق فزون ہو
سو کتاب خانۂ دہر میں ترے حسن کی وہ کتاب ہے

کبھی ساعتوں کا شمار ہے کبھی ہے شمارِ ستارگان
شبِ انتظارِ بتاں خدا مرے حق میں روز حساب ہے

میں خموش پاسِ ادب سے ہوں ، وہ ہے چپ غرورِ جمال سے
نہ تو رمز ہے نہ کنایہ ہے نہ سوال ہے نہ جواب ہے

ترے ہجر میں بتِ دلستاں بخدا کہ اس دل و چشم کو
نہ تو صبر ہے نہ سکون ہے نہ قرار ہے گا نہ خواب ہے

یہ شبیں فراق میں کیوں کٹیں کہ فسوس پھیر کرے گا تو
جو مزا ہے آج سو کل نہیں کہ اخیر عہدِ شباب ہے

۵۔ انور، محمد انوار الدین:

اصل نام محمد انوار الدین تھا۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ اچھے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد بادشاہ دہلی (غالباً احمد شاہ) کے منصب داروں میں تھے۔ دہلی سے ترک سکونت کر کے مئو محمد آباد میں قیام پذیر ہوئے۔ انور ایک لائق نوجوان تھے۔ وہ حافظ قرآن تھے اور بہت خوش

اخلاق اور خلیق و متواضع تھے۔ پہلے قانع تخلص کرتے تھے پھر انور پسند کیا۔ میر سوز کے شاگرد تھے۔ طبیعت موزوں اور مناسب پائی تھی۔ (۲۵)

انور کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے استاد کی کام یاب حد تک پیروی کی ہے۔ زبان کا اسلوب، طرز ادا، سادگی و صفائی میں وہ میر سوز کے رنگ کو خوب نبھاتے ہیں انھوں نے بہت سی غزلیں استاد کی زمین میں کہیں اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ اپنے نامور استاد کے قدم بہ قدم چلے ہیں۔

نمونۂ کلام:

انور:

مرا دست وفا، دامان قاتل ایک دن ہوگا ستم کا اس کے بدلہ ہاں مرے دل ایک دن ہوگا
مجھے کہنے لگا وہ، دیکھ رکھ شمشیر میری کو ارے ڈرتا رہا کر ورنہ بسمل ایک دن ہوگا

سوز:

سرشک شمع آخر شمع محفل ایک دن ہوگا یہ آنسو رفتہ رفتہ جمع ہو دل ایک دن ہوگا
بھلا جو دل کو لے بھاگا تو رو کر چپ رہا تھا میں یہ خاطر میں نہ تھا جی کا بھی سائل ایک دن ہوگا

انور:

پوچھنا کیا ہے کہ جاؤں یا نہ جاؤں یار پاس مت ستا تو مجھ کو دل، میری بلا سے جا نہ جا
گو ہمیں بوسہ نہ دے پر سامنے آنکھیں تو کر جان یہ کیا طور ہے اتنا بھی تو شرما نہ جا
حال دل انور کا سن بے رحم ٹک انصاف کر راست کہتا ہوں تو میری بات پر ہنستا نہ جا

سوز:

مجھ کو تنہا چھوڑ کر اے شوخ بے پروا نہ جا جان تیرے ساتھ جائے گی ذرا ستا نہ جا
جب تلک بیٹھا ہے تو جب تک ہے میرے جی میں جی اے بلا گرداں ہوں میں تیرے یہیں رہ جا نہ جا
کیوں رے دل آخر کو پچھتایا نہ کر کے عاشقی تجھ کو میں کہتا نہ تھا آ ہر کہیں بے جا نہ جا
ایک دم تو دیکھ لوں دیدار اپنے دوست کا اے اجل جلدی نہ کر اے عمر ٹک ستا نہ جا
دیکھ تو کیا کیا ستم میں نے سہے تیرے لیے ٹک تو بیٹھا رہ ابھی تو اے کرم فرما نہ جا

شوخ ہی آوے گا خود داری بھی لازم ہے تجھے　　سوز یہ کیا طور ہے اتنا بھی تو گھبرا نہ جا

انور :

جگر سے اشک ، دل سے نالہ سینے سے فغاں نکلا　　کدھر کا قصد کر ان گھر بسوں کا کارواں نکلا
میاں سچ ہے تمہارا وعدۂ فردا قیامت ہے　　گذر جاتی ہے جب شب اتنے کہنے میں کہ ہاں نکلا
سنی ہے خط نکلنے کی خبر اچھا مبارک ہو　　بھلا ٹک اس طرف پھیرو تو منھ دیکھوں کہاں نکلا
دیا تھا دل اسے بھولا سمجھ کر واہ ری قسمت　　وہ ایسا فتنۂ جاں شوخ چشم و بد زباں نکلا
سفر کی سن کے انور کی خبر بولا شتابی سے　　چلو اچھا ہوا میری گلی سے ناتواں نکلا

سوز :

جگر سے آہ ، دل سے نالہ ، سینے سے فغاں نکلا　　سرائے تن سے کیا حسرت زدوں کا کارواں نکلا
سحر گہ تیغ کاندھے پر جو وہ دامن کشاں نکلا　　عجب ہر زخم سے اس وقت شور الاماں نکلا
وہی دل جو مرے پہلو میں تھا اب عرش اعظم ہے　　خدا کے واسطے دیکھو کہاں سے جا کہاں نکلا
غریب و ناتواں میں نے سمجھ کر دل کو پالا تھا　　سو یہ بندہ بھی میرے حق میں رستم داستاں نکلا
تمھاری رات کا احوال روشن ہوئے گا سب پر　　خدا کے واسطے جوں شمع مت میری زباں نکلا
ہمیشہ عاشق صادق جو اپنا مجھ کو سمجھے تھا　　سو بہکاسے سے نامردوں کے وہ بھی بدگماں نکلا

انور کے مزید کچھ اشعار بطور نمونہ لکھے جاتے ہیں :۔

دل میں ہے محفل خوباں میں مکاں کیجئے گا　　پھر سر نو سے دل پیر جواں کیجئے گا
ہاتھ چھوڑوں گا نہیں آج تمھارا صاحب　　ہاں جی ہنسئے گا نہیں دل کے نشاں کیجئے گا

نہیں ہم جانتے گل کس طرح کا ہے سمن کیسا　　نہ دیکھیں یار کا منہ جس جگہ باغ و چمن کیسا
شہید تیغ ناز دلبراں ہم ہوگئے انور　　کہاں کا غسل کاہے کا لحد گور و کفن کیسا

اب تو کرتا ہے مرے دل کو تو حیران بھلا　　میں بھی سمجھوں گا بھلاؤ تو مری جان بھلا
کچھ تجھے رحم نہ آیا مری تنہائی پر　　یوں مجھے چھوڑ گیا او دل نادان بھلا

اور تو تجھ سے کسی چیز کی امید نہیں　　پر مرے پیارے اب اتنا تو کہا مان بھلا
آن کر مجھ سے کبھی پوچھ کہ کیا ہے تجھ کو　　جی سے نکلے تری باتوں ہی کا ارمان بھلا

یہ کیا قد و قامت ہے حضرت سلامت　　کہ جی پر قیامت ہے حضرت سلامت
نہیں دیکھا تم نے اسے شیخ صاحب　　جو ہم پر ملامت ہے حضرت سلامت
کوئی دن نظر آگیا تو کہیں گے　　کہ صاحب سلامت ہے حضرت سلامت

اگر ہے یہی جور حضرت سلامت　　تو جینے کا کیا طور حضرت سلامت
رقیبوں سے خوش ہم سے بیزار سچ ہے　　بھلے کا نہیں دور حضرت سلامت

چلے جاؤ مت جھوٹی باتیں بناؤ　　اگر ہم سے ملتے تو ڈر تھا کسی کا

کوئی گالی ہی او مرے بانکے　　میں تمھاری زبان کے قرباں
جامہ زیبی میں کیا قیامت ہے　　اس سجیلے کی شان کے قرباں

کیا مجھ کو اچنبھا ہے مجھ سار کے فدوی بن　　کیوں کر تمہیں بھاتی ہیں غیروں سے ملاقاتیں
انور نے کہا یک شب آؤ تو ہمارے گھر　　ہنس ہنس کے لگا کہنے آنے دو بڑی راتیں
میاں سونے نہ دوں گا کیوں یہ ناحق مکر کرتے ہو　　کہ میں نے آتے ہی جھپکی ہوئی تیری پلک دیکھی

۶۔ ترقی، محمد تقی خاں:

اسد الدولہ رستم الملک مرزا محمد تقی خاں بہادر ترقی کے والد کا نام سید محمد امین خاں نیشاپوری تھا۔ فیض آباد میں اپنے گھر پر مشاعرے کراتے تھے۔ مصحفی ان کا ذکر بہت احترام سے کرتے ہوئے کہتے ہیں " ایک جوان ہے باغ و بہار، کشیدہ قامت، موزوں لباس سے آراستہ، سخی، آغاز شعر گوئی سے اب تک خلوص دل سے اہل کمال اور شاعروں کی رقم سے امداد کرتے ہیں اور ہر کس و ناکس کو محروم نہیں رکھتے (۲۶)۔ ہر شخص کی تواضع کرتے تھے۔ کلام درد آلود اور رنگین ہے۔ نواب وزیر الملک کے رشتہ داروں میں سے تھے اور شرف تلمذ میر سوز سے

رکھتے تھے (۲۷)۔ صاحب دیوان تھے۔ مصحفی، قاسم، اور تنہا نے ترقی کے استاد کا ذکر نہیں کیا ہے۔ نساخ (۲۸) اور سید علی حسن خاں (۲۹) نے ان کو میر سوز کا شاگرد لکھا ہے۔

نمونۂ کلام:

دنیا کے جو مزے ہیں ہرگز وہ کم نہ ہوں گے
چرچے یہی رہیں گے افسوس ہم نہ ہوں گے

آواز عشق ہی میں شکوہ بتوں کا اے دل
تک صبر کر ابھی تو کیا کیا ستم نہ ہوں گے

بلبل کے درد دل کا ممکن نہیں مداوا
گلچیں کے ہاتھ دونوں جب تک قلم نہ ہوں گے

یاران رفتگاں پر کیا روئیں ہم ترقی
کیا ہم روانہ سوے ملک عدم نہ ہوں گے

کیا شعاع حسن اس خورشید رو کے تن پہ ہے
پرتو ایسا نور کا جو سارے پیراہن پہ ہے

قتل کی لذت کا گر منہ سے ادائے شکر ہو
حشر تک احسان قاتل کا مری گردن پہ ہے

جھاڑ کر چلتا ہے اٹھ کر بیٹھتی ہے پھر وہیں
خاک کس حسرت بھرے کی یہ ترے دامن پہ ہے

یاد آتے ہیں نکیلے وہ مژہ ٹانکے کے وقت
اس لیے میری نگہ جراح کے سوزن پہ ہے

جرم کچھ ٹھہرائے قاتل پھر مجھے تو قتل کر
بے گناہی میری ثابت دوست اور دشمن پہ ہے

ساکنان کعبہ نے کی بت پرستی اختیار
وہ صنم نام خدا کیا ان دنوں جوبن پہ ہے

جھانکنے میں چشم بیمار اس کی جب دکھلائی دی
میں نے جانا پھول نرگس کا دھرا روزن پہ ہے

دیکھئے اب کس مسلمان کو کرے گا قتل تو
آج غصہ بے طرح کافر تری چتون پہ ہے

تونے اک دن بھی نہ دیکھا چڑھ کے اپنے بام پر
روز اس کوچے میں ہنگامہ مرے شیون پہ ہے

ہے ترقی میرے اس سینے میں وہ آتش نہاں
طعنہ زن جس کا شرر ہر شعلۂ گلخن پہ ہے

کاتبِ تقدیر گر نالہ سنے تاثیر کا
محو ہوکر لوح پر رکھ دے قلم تحریر کا

خوب ڈھونڈا چیر سینہ اس نے مجھ دلگیر کا
چاک جب دل کو کیا تب نکلا پیکاں تیر کا

صبح تک رہتا ہے اس مہ کا شب مہ میں خیال
چاند بھی گویا ورق ہے یار کی تصویر کا

تونے عاشق کی بھی کچھ اپنے خبر پائی ہے　　جان دیتا ہے وہ اور خلق تماشائی ہے

در و دیوار سے آتا ہے نظر جلوۂ دوست　　آئینہ خانہ مرا گوشۂ تنہائی ہے

س عشق کے داغوں سے بہت پھولے پھلے ہم　　اک ٹہنی بنفشہ کی تھی جس وقت جلے ہم

لون سا گل اس باغ میں آیا رنگ اور روپ جو لوٹ گیا
کس نے آنکھ لڑائی تھی جو دیدۂ نرگس پھوٹ گیا

اے ترقی بات جی کی جی میں رکھ　　منھ سے نکلی اور پرائی ہو چکی

اس نے تو دکھ یہ دکھایا ہے کہ جی جانے ہے　　پر مزا میں نے یہ پایا ہے کہ جی جانے ہے

۷۔ جان، جان عالم خاں:

آپ کا پورا نام جان عالم خاں تھا۔ والد کا نام نواب منور خاں تھا۔ نواب منور خاں کے سے بھائی نواب روشن الدولہ ظفر خاں ولد مفتخر الدولہ شہزادہ رفیع الشان کی سرکار میں ملازم تھے۔ (۳۰) اصل نام تو خواجہ مظفر تھا لیکن شہزادہ رفیع الشان نے ظفر خاں خطاب دیا، اور ایک ہزار پانچ سو سواروں پر افسر مقرر کیا۔ شہزادہ رفیع الشان اورنگ زیب عالم گیر سے جنگ کرتا ہوا مارا گیا۔ تو ظفر خاں بھی بے سہارا ہوگئے۔ آقا کی موت نے کچھ ایسا دل برداشتہ کیا کہ ترک دنیا کرلیا۔ دہلی کے خراب حالات کے باعث یہ خاندان فرخ آباد چلا گیا۔ جان عالم خاں کی پرورش فرخ آباد ہی میں ہوئی۔ تعلیمی استعداد معقول تھی۔ علوم عربیہ سے واقف تھے۔ نثر اچھی لکھتے تھے اور اچھے خوشنویس بھی تھے۔ خط نستعلیق اور خط شکستہ میں مہارت رکھتے تھے۔ حسن اور بخشی کی جو داستان جرأت نے قلم بند کی ہے اس میں متن طوائف کے یہاں خواجہ حسن کا جانا اور اس کو پیام راحت طوائف کا دینا جان عالم خاں کی فرمائش ہی سے نظم کیا ہے۔ آپ کا شمار اچھے نثر نگاروں میں ہوتا تھا (۳۱) میر سوز سے اصلاح لیتے تھے۔ رقص و سرود سے بے پناہ لگاؤ تھا۔ ایک شعر آپ کا زبان زد عام ہے۔ (۳۲)

نمونۂ کلام:

چھوڑ عارض دل نے گھیرا زلف مشکیں فام کو　　صبح کا بھولا غنیمت ہے جو پہنچے شام کو

لگا خوبان نو خط سے یہ ملنے گھسیٹا پھر مجھے کانٹوں میں دل نے

بیٹھا ہوں یار آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے جوں نابداں میں شیشہ رنگیں دھرے ہوئے
اس سنگ دل کے دل میں ذرا بھی نہ راہ کی دور از اثر سدا رہی ، ہت تیری آہ کی

۸۔ حیف ، موتی لال :

حیف کا نام موتی لال تھا۔ والد کا نام بت سین یا بدھ سین تھا۔ ذات کے کائستھ تھے۔ دبی پرشاد بشاش نے باپ کا نام شبھ یا شب سنگھ بتایا ہے (۳۳) نساخ نے حیف کو میر سوز کا شاگرد لکھا ہے (۳۴) ۔

نمونہ کلام :

گلشن دہر میں کیوں کر وہ بھلا شاد رہے رات دن جس کے لیے گھات میں صیاد رہے
نہ ساحل سوجھتا ہے نے کنارا ہے نظر آتا محبت نے ہمیں کس گھاٹ دیکھو لا اتارا ہے
بنا گوش بلوریں پر یہ در لگتا پیارا ہے کہ جیسے متصل مہتاب کے ہوتا ستارا ہے
جو ہو اک بات اس میں قتل کی تو میں کہوں اس کو ادا ہے ناز ہے ، غمزہ ہے آنکھوں کا اشارا ہے

۹۔ داغ ، میر مہدی :

میر سوز کے صاحبزادے تھے۔ پہلے آہ تخلص کرتے تھے بعد میں داغ اختیار کیا۔ (۳۵) کریم الدین (۳۶) لکھتے ہیں :

" یہ عجب اک جوان تھا۔ نیکو رو ، زیبا شمائل ، باوجود دلربائی کے بے دلی پر مائل ، تشبیہ گل کی اس کے ساتھ دو معنی سے درست ہے یعنی خود بھی سینہ چاک اور سینہ واسطے چاک کرنے کے بھی دیتا تھا۔ اور مشابہت لالہ کی بھی اس کے ساتھ دونوں صورتوں سے موافق یعنی دل بھی اس کا داغ اور لوگوں کے دلوں پر بھی داغ رکھتا تھا۔ حاصل کلام بیس برس کی عمر میں ایک گل رو پر داغ کھایا یعنی عاشق ہوا۔ ایک مدت عیش و عشرت میں اس نو بہار حسن سے مشغول رہا۔ آخر کو دام ہجراں میں پھنسایا۔ بے طاقتی نے اس کا کام تمام کیا قریب تھا کہ مرجائے یاروں نے بہت سعی کی اس کی جان بچانے کی ، جہاں تک ہوسکی کی ، اور اس کے

معشوق کو تکلیف رفتار کی دی لیکن اس نے واسطے اپنے دیوانے کی تسلی کے یہ لکھ بھیجا کہ کل آؤں گا۔ اس عاشق بیچارہ نے جو کہ حالت جاں کنی میں تھا، یہ جانا کہ کل سے مراد روز قیامت ہے اسی وقت مرگیا۔"

کریم الدین کی عبارت آرائی سے قطع نظر مصحفی (۳۷) اصل واقعے کو مختصراً بیان کرتے ہیں کہ داغ نہایت خوب صورت اور خوش خو نوجوان تھے کسی زن بازاری پر عاشق ہوگئے۔ وصال محبوب زیادہ دنوں حاصل نہ ہوا کچھ دنوں کے بعد جدائی ہوگئی اور وہ کسی دوسری جگہ چلا گیا۔ دارفتگی اور آشفتگی نے بستر مرگ پر پہنچا دیا۔ مرنے سے پہلے محبوب کا خط ملا جس کے جواب میں یہ شعر لکھا اور محبوب مجازی سے رشتہ توڑ کر محبوب حقیقی سے جاملے۔

از جان رمقے بود کہ مکتوب تو آمد
دیگر چہ نویسم خبرم خوب گرفتی

جرأت نے تاریخ وفات کہی:

جا بسا جو گلشن جنت میں وہ　　بدتر از دشت اب جہاں کا باغ ہے
جرأت اس کی ہے یہ تاریخ وفات　　سید مہدی کا ہے ہے داغ ہے

۱۲۰۴ھ مطابق ۱۷۸۹ع

کلب علی خاں فائق نے اس روایت کو صحیح تسلیم نہیں کیا ہے کہ داغ کی موت بیس سال کی عمر میں ہوئی (۳۸)۔ جہاں تک داغ کی عمر کے تعین کا سوال ہے ہمارے پاس دوسرا کوئی ثبوت ایسا نہیں ہے جس سے ہم کریم الدین کی روایت کو غلط ثابت کردیں۔ داخلی شہادتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم نے محتاط اندازے کے بموجب سوز کی شادی کا تعین تیس سال کی عمر کا کیا ہے اس طرح ان کی ازدواجی زندگی کا آغاز ۱۱۵۵ ہجری مطابق ۱۷۴۲ع سے ہوتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ داغ کی پیدائش شادی کے بہت عرصے بعد بڑی مرادوں اور منتوں کے بعد ہوئی۔ سوز نے داغ کا جو مرثیہ لکھا ہے اس کے پہلے شعر میں اسی طرف اشارہ ہے۔

آ جا مری منتوں کے پالے
اے پیارے جھنڈولے بالوں والے

لہذا وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ داغ کی پیدائش فرخ آباد میں ۱۱۸۳ ہجری مطابق ۱۷۶۹ع کے لگ بھگ ہوئی۔ عظیم آباد پٹنہ میں سوز نے اشعار میں اپنی جس دل گرفتگی اور بیزاری کا اظہار کیا ہے اس کیفیت میں ایک جگہ کہتے ہیں:

سید الشہدا کو سونپ آیا ہوں دلبندوں کو میں
وہ ملا دیں گے مجھے اک ایک کا کر کے حساب

اس شعر سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت سوز کے بچے بہت کم عمر تھے۔ بہرحال داغ کی موت پر سوز نے جو مرثیہ کہا ہے اس سے ہمارے سامنے ان کا جو سراپا آتا ہے وہ بالکل نو عمری کا ہے۔

داغ کے جو اشعار محفوظ رہ گئے ہیں ان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ کہنے والا نو مشق ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ ان کا انداز بیان اپنے والد ماجد کی مانند ہے۔ سادگی، بے ساختگی کے ساتھ درد عشق کی کسک کلام میں بڑی تاثیر پیدا کر دیتی ہے۔

نمونۂ کلام:

اسی کے پاس تھا دل کیا ہوا اے ہم نشیں دیکھو — ادھر دیکھو، ادھر دیکھو، یہاں دیکھو، کہیں دیکھو
اسی کے پاس ہے رہ رہ کے یہ جو مسکراتا ہے — اسی کی جیب دیکھو، ہاتھ دیکھو، آستیں دیکھو
پکڑنا چور کا مشکل نہیں گر کچھ سمجھ ہووے — ہوائی رنگ دیکھو، ماہتابی سی جبیں دیکھو
آہ نکلے نہ دل کی آہ کہیں — ہو نہ جاوے جہاں سیاہ کہیں
دل کے ہاتھوں کہاں چھپیوں جاکر — مجھ کو ملتا نہیں پناہ کہیں (۳۹)

رباعی:

یہ چاہ نہیں بھلی، بری ہوتی ہے — جی لیتی ہے دوستی بری ہوتی ہے
لگتا ہی نہیں ہے جی کہیں اس بن آہ — سچ کہتے ہیں، یہ لگی بری ہوتی ہے

۱۰۔ رند، نواب مہربان خاں:

مہربان خاں رند کا ذکر معاصر تذکرہ نگاروں نے بہت اہتمام اور احترام سے کیا ہے۔ قائم لکھتے ہیں کہ وہ ذہن سلیم اور طبع مستقیم رکھتے ہیں۔ موزونی طبع کے اقتضاء سے اہل سخن اور ارباب فن سے محبت کرتے ہیں۔ اہل کمال کی تربیت ہی کا اثر ہے کہ ان کے کلام میں اتنی ترقی ہوگئی ہے کہ اچھے شاعروں کو ان کا مقابلہ کرنا مشکل ہے۔ (۴۰) میر حسن کہتے ہیں کہ رند میر سوز اور مرزا رفیع سودا کے شاگرد تھے۔ اشعار کہنے میں خاص مہارت تھی (۴۱) قاسم مزید

اضافہ کرتے ہیں کہ نواب احمد خاں کی زندگی میں شان و شوکت سے زندگی بسر کرتے تھے تقریباً تمام تذکرہ نگار ان کی تعریف کرتے نظر آتے ہیں۔ اگرچہ ان کی علمی قابلیت زیادہ نہ تھی مگر علم مجلسی سے کماحقہ واقف تھے۔ مصحفی کہتے ہیں کہ وہ جاہل تھے اور ان کا تلفظ بھی درست نہ تھا۔ (۴۲) اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ رند کسی غیر معروف ہندستانی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور لہجہ دیہاتیوں جیسا تھا۔ لیکن ان کی علم پروری کی تعریف کرتے ہوئے مصحفی کہتے ہیں کہ جب فرخ آباد میں ان کا دور اقتدار تھا تو انھوں نے علم و فن کی قدر دانی پر ہزار ہا روپیہ صرف کیا۔ ان کو علم موسیقی، شعر گوئی اور مرثیہ گوئی کا بہت شوق تھا۔ کبت، دوہرہ اور ہندی شاعری کے ماہر تھے فن سپہ گری، بانک پٹے، شمشیر زنی اور تیر اندازی میں کمال حاصل تھا ان علوم و فنوں میں میر سوز سے بھی استفادہ کیا تھا۔ ان کو علم قیافہ شناسی سے بھی لگاؤ تھا۔ (۴۳)

رند کی علم دوستی اور سخن پروری کے باعث ہی میر سوز فرخ آباد میں مقیم رہے۔ سودا بھی اسی کشش کے باعث وہاں جا پہنچے ۱۱۷۶ ہجری مطابق ۱۷۶۲ء میں رند کی شادی ہوئی سودا نے قطعہ تاریخ کہا:

صبا اس دوست کو جا تہنیت دے — جو عاشق ہے محبت پروری کا
کہی اے مہرباں صاحب یہ تاریخ — ہوا ہے وصل ماہ و مشتری کا

۱۱۷۶ ہجری

غالباً اسی موقع پر میر سوز نے بھی یہ غزل کہی:

جسے ہو تخت کا دعویٰ اسے افسر مبارک ہو — ہمارے سر کو محبوبوں کی خاک در مبارک ہو
دعا ہم نو گرفتاروں کی حق سے ہے یہی اپنی — ہمارے باندھنے صیاد بال و پر مبارک ہو
نہ جانیں آپ کا ملنا مناسب ہم تو غیروں سے — تمھاری خو، کہا غیرت نے، لو بہتر مبارک ہو
جہاں میں اس سے کیا بہتر کہ حق حقدار کو پہنچے — ہمارے دل کو لے جانا تجھے بہتر مبارک ہو
فلک شب کتخدائی کی تری، اے سوز یوں بولا — تجھے یہ رات اے رشک مہ انور مبارک ہو

ایک جگہ میر سوز اپنے قدردان شاگرد کی تعریف اس طرح کرتے ہیں کہ خود اپنی تعریف کا پہلو بھی نکل آتا ہے:

کون ہے اب مہرباں سا رند ہو جس کا خطاب — کون ایسا ہے کہ جس کا سوز سا استاد ہو

رند اگرچہ صاحب علم نہ تھے لیکن شعری ذوق اچھا تھا ایک جگہ سوز بھی اعتراف کرتے ہیں :۔

دیوان مہربان جو دیکھا تو کہوں کیا　　جو بیت ہے اس کی سو وہ سانچے میں ڈھلی ہے

نواب احمد خاں بنگش کی وفات کے بعد حالات رند کے موافق نہ رہے۔ چناں چہ انھوں نے فرخ آباد کو چھوڑ دیا قاسم لکھتے ہیں کہ رند نے نواب احمد خاں بنگش کے مرنے کے بعد ان کے مختار عام نواب ذوالفقار الدولہ کے چیلے شرف الدولہ افراسیاب خاں کی لڑکی سے شادی کرلی تھی لہذا وہ اپنے خسر افراسیاب خاں کے پاس دہلی چلے گئے اور وہاں بہ خوبی گذران کرتے تھے۔ (۳۵)

افراسیاب خاں کی لڑکی سے غالباً مہربان خاں رند کی دوسری شادی ہوئی ۔ دہلی میں رند ۱۱۹۴ ہجری مطابق ۱۷۸۰ ع تک رہے اور پھر لکھنؤ چلے آئے۔ لکھنؤ میں وہ محلہ رستم نگر میں رہتے تھے مصحفی وہیں مرزا فتیل کے ہمراہ ان سے ملے تھے (۳۶) لکھنؤ ہی میں وفات پائی اور حاجی نصرت کے تکیے میں دفن ہوئے۔ (۳۷) تذکروں میں رند کے نام سے جو کلام درج ہے وہ تقریباً سب کا سب سوز کا ہے۔ تذکرہ نگاروں نے بھی اس بات کی تصریح کی ہے کہ رند کے دیوان میں جو کلام ہے اس میں بیشتر سودا اور سوز کا ہے با ایں ہمہ رند کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ حاتم کی تضمین رند کے مصرع پر ہے۔ غالباً یہ غزل اس زمانے کی ہے جب رند دہلی میں رہتے تھے۔

تضمین مصرع مہربان رند در ۱۱۹۴ ہجری مطابق ۱۷۸۰ ع (۳۸)

اس منہ سے کلام کچھ نہ نکلا　　جز تیرا ہی نام کچھ نہ نکلا
قاصد کی زباں سے اس کے آگے　　پیغام و سلام کچھ نہ نکلا
دل جانے تھا عشق میں ہے پختہ　　تھا بسکہ یہ خام کچھ نہ نکلا
بازار سے آئے ہاتھ خالی　　کھیسے میں سے دام کچھ نہ نکلا
چاہیں تھے کہ دیں کسی کو کچھ ہم　　گھر ڈھونڈھا تمام کچھ نہ نکلا
یک عمر ہوئے خراب پھرتے　　مجھ سے مرا کام کچھ نہ نکلا
حاتم کو خوش آیا مصرع رند　　یارب یہ غلام کچھ نہ نکلا

۱۱۔ سوزان، شمس الدین:

اصل نام شمس الدین تھا دہلی کے باشندے تھے ترک وطن کر کے فرخ آباد آگئے تھے۔ فوج میں ملازم تھے۔ مزاج میں شوخی زیادہ تھی جو کلام میں بھی نظر آتی ہے۔ میر سوز سے شرف تلمذ تھا۔ (۴۹)

نمونۂ کلام:

اس کے کوچے میں نہیں ہم کو کسی کا خطرہ　　پر خفا وہ نہ ہو آتا ہے اسی کا خطرہ

ہردم مجھے دھمکاتے ہو تلوار پکڑ کے　　ہاں جاؤ کہیں گھر سے تو آئے نہیں لڑکے
دوچار رقیبوں پہ نہ دھمکائیو ہم کو　　مل جائیں گے دو ہاتھ جو مارے کہیں کڑکے

۱۲۔ طپاں، سید قدرت علی:

سید قدرت علی دہلوی نام تھا۔ آپ میر سوز کے دوسرے صاحب زادے تھے۔ شرف تلمذ اپنے والد ماجد سے رکھتے تھے اور سوز کی رعایت سے تخلص طپاں اختیار کیا تھا (۵۰) طپاں کے صاحبزادے کا نام سید علی حسن تھا۔ وہ شرر تخلص کرتے تھے۔ نساخ لکھتے ہیں کہ شرر ۱۲۸۰ ہجری مطابق ۱۸۶۳ ع میں کلکتہ آئے تھے راقم کے ملاقاتی ہیں انھوں نے اپنے کچھ اشعار نساخ کو دیے تھے (۵۱) شرر کا طرز بھی میر سوز کی طرح ہے۔ نساخ اگر شرر کا ذکر تفصیل سے کرتے تو میر سوز کے بارے میں مزید معلومات حاصل ہوسکتی تھیں۔ طپاں کے اشعار دستیاب نہ ہوسکے۔ صرف نساخ نے شرر کے دو شعر لکھے ہیں:۔

نکل ہرگز نہ چشم تر سے لخت دل نہ بن لڑکا　　ادھر شدت ہے مینھ کا خوف ہے رستے میں ہے کڑکا

جو اہل سوز ہیں نیرنگی عالم سے کیا ان کو　　بہار نخل شمع بزم کو کیا ڈر ہے پت جھڑکا

۱۳۔ عیش، مرزا حسین رضائی:

پورا نام مرزا حسین رضا تھا۔ قوم سادات سے تھے اور میر سوز کے شاگرد تھے (۵۲)۔ مصحفی کہتے ہیں کہ وہ جوان خندہ رو خوش خلق اور متواضع تھے (۵۳) شاہ کمال نے ان کا نام مرزا حسین لکھا ہے اور کہا ہے کہ "میں نے ان کو لکھنو میں دیکھا تھا۔" (۵۴)

یہاں پر ایک بات ملحوظ رکھنا چاہیے کہ قدرت علی قدرت کے ایک شاگرد مرزا عسکری کا تخلص بھی عیاں (۵۵) تھا۔ بعض تذکرہ نگاروں نے حسین رضا عیش کا ایک شعر مرزا عسکری عیش سے منسوب کر دیا ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ مرزا عسکری عیش سوز کے شاگرد تھے (۵۶) ۔ مرزا حسین رضا عیش کا نمونہ کلام یہ ہے۔

وہ اگر ہووے پیش بام کہیں میں بھی کرلوں اسے سلام کہیں
کیا ہے یہ قطرہ قطرہ دے ساقی ایک باری تو بھر کے جام کہیں
یہ غزل عیش ہے تصدق سوز مجھ سے ہوتی ہے انصرام کہیں

۱۴۔ عیاش، میر محمد یعقوب:

اصل نام میر محمد یعقوب تھا۔ ان کے والد کا نام میر محمد انور تھا۔ عیاش کی پرورش اور نشوونما لکھنو میں ہوئی ان کے بزرگ شاہجہاں آباد کے رہنے والے تھے۔ اور شاہی ملازمت سے سرفراز تھے۔ عیاش مہذب اور با اخلاق جوان تھے۔ ابتدائے جوانی ہی سے طبیعت کی موزونی کے باعث شعر کہتے تھے ، اور اساتذہ فن کی صحبتوں سے مستفید ہوتے تھے۔ شروع میں انھوں نے میر سوز سے کسب فن کیا بعدہٗ میر تقی میر سے رجوع کیا ، پھر میر قمر الدین منت سے اصلاح لی آخر میں زانوے تلمذ مصحفی کے سامنے تہہ کیا مصحفی ان کی بابت لکھتے ہیں کہ ان کی عمر چالیس سال سے اوپر ہے اور ان کے کلام میں اصلاح کی کوئی گنجائش نہیں ہے (۵۷)۔ عیاش نے ۱۲۳۷ ہجری مطابق ۱۸۲۲ع میں وفات پائی۔

دیوان ناسخ میں ایک قطعہ تاریخ وفات میر محمد یعقوب عیاش کا موجود ہے (۵۸)

افسوس افسوس میر یعقوب افسوس از مردن خود مرا رسانده آلام
تاریخ وفات او نوشتم یارب عیاش بفردوس کند عیش دوام

دیوان ناسخ میں کتابت کی غلطی سے عباس لکھا ہوا ہے اس وجہ سے صحیح سنہ وفات نہیں نکلتا ہے ، جب کہ عیاش سے صحیح سنہ نکل آتا ہے ۔ ویسے بھی چوتھے مصرع میں لفظ عیش کا تقاضا بھی یہ ہے کہ عباس کی بجائے عیاش ہو۔

نمونۂ کلام:

اللہ ری تیرہ بختی کہ مرنے کے بعد یار — سوسن کے پھول قبر پہ میری چڑھا گیا
قدرت خدا کی دیکھو مرے دل کے زخم کو — چھڑکے تھا جو نمک وہی مرہم لگا گیا
تھا شہرہ بدگمانی کا عیاش جس کی کل — دو چار گالیاں وہ مجھے بھی سنا گیا

دل بھرا آئے ہے جوں جوں اسے خالی کیجے — فکر اس درد کی کیا اے مرے والی کیجے
ایک پرواز ، بھی گلشن میں نہ کرنے پائے — کیا ترے ہاتھ سے اے بے پر و بالی کیجے
ہوں سیہ بخت ازل میں تو عزیزاں میرے — بعد مرنے کے تلک اک قبر بھی کالی کیجے
گولی بھر کر وہ طمنچہ میں کہے ہے اس کو — دل میں آتا ہے کہ عیاش پہ خالی کیجے

سایہ کرے گرمی میں کسی خاک نشیں پر — وہ نخل کہاں ہے ترے کوچے کی زمیں پر
گھوڑے پہ چڑھا وہ تو ہر اک کو نظر آیا — بت خانۂ چیں کا سا سماں خانۂ زیں پر
سجدہ کروں ہر بت کو میں اے کاتب قدرت — لکھا تھا یہی تونے مگر میری جبیں پر
وہ سوختہ دل ہوں کہ مری آہ کی بجلی — گرتی ہے سدا گنگرۂ عرش بریں پر
پڑھتا ہوں دل اپنے کا جہاں مرثیہ عیاش — روتی ہے سبھی خلق مری موت حزیں پر

نہ کہیے درد دل ہرگز کسی سے — اگر کہیے تو کہیے اپنے جی سے
کٹے گی کیوں کہ ساری رات اس بن — کرے ہے دل تو بے تابی ابھی سے
جدائی میں جیوں کب تک میں عیاش — بھلی ہے موت ایسی زندگی سے

خنجر بے داد کو سنگ فساں پر تیز کر — وقت قتل اتنا ترحم مجھ پہ اے خوں ریز کر

۱۵۔ فریاد، لالہ صاحب رائے:

فریاد کا نام لالہ صاحب رائے تھا۔ باپ کا نام سندھی مل، ذات کے کائستھ تھے لکھنؤ

کے رہنے والے تھے سوز سے اصلاح لیتے تھے۔ پہلے قربان تخلص کرتے تھے پھر فریاد اختیار کیا۔ ۱۱۹۶ ہجری مطابق ۸۲-۱۷۸۱ ع میں لکھنؤ سے اپنے اشعار خلیل کو بنارس بھیجے تھے (۵۹)۔ طبقات الشعرائے ہند میں فیلن وکریم الدین نے تشریح کی ہے کہ ۱۱۹۶ ہجری مطابق ۱۷۸۱ ع میں لکھنؤ میں رہتے تھے۔ انھوں نے ان کے باپ کا نام سندھ لال لکھا ہے (۶۰)۔ سخن الشعراء میں باپ کا نام لالہ سند رائے لکھا گیا ہے (۶۱) تذکرہ شعرائے ہنود میں سندر رائے بیان کیا گیا ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے (۶۲)

قتل کا اپنے لکھا ہے میں نے مضموں بیشتر　　واسطے میرے ، مرا دیوان محضر ہوگیا
تلخیٔ ہجراں مرے کام آئی آخر روز بد　　زہر بھی میں نے پیا تو شیر مادر ہوگیا
چین پایا وہ پس مردن دل بے تاب نے　　گوشۂ مرقد ہمیں آغوش مادر ہوگیا

غم جب سے ہوا ہے یار دل کا　　کوئی نہیں غم گسار دل کا

دل کو امید رہائی سے اٹھایا ہم نے　　عشق کے دام میں جب پاؤں پھنسایا ہم نے (۶۳)
جان کر حال ہمارا نہ سنا اس نے کبھی　　سو طرح رمز و اشاروں سے سنایا ہم نے

۱۶۔ شوخ، گنا بیگم :

علی قلی خاں ۱۱۳۴ ہجری مطابق ۲۲-۱۷۲۱ ع میں داغستان سے دہلی پہنچا۔ محمد شاہی دربار سے ہفت ہزاری کا منصب اور حیدر علی خاں ، خان زماں خان بہادر ظفر جنگ کا خطاب ملا۔ خود فارسی کا بہت اچھا شاعر تھا اور والہ تخلص کرتا تھا۔ گنا بیگم اسی کی لڑکی تھیں ان کی شادی عماد الملک کے ساتھ ہوئی تھی۔ ان کے بطن سے نصیر الدولہ بن عماد الملک پیدا ہوا۔

تمام تذکرہ نگاروں نے گنا بیگم کا ذکر نہایت اچھے الفاظ سے کیا ہے۔ صاحب مجموعۂ نغز گنا بیگم کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں (۶۴) :۔

" بعض کہتے ہیں کہ مرحومہ متنظر تخلص کرتی تھیں۔ بہرحال یہ بات تحقیق کو نہیں پہنچتی ہے　　ان کا ذکر میم کے تحت نہیں کیا گیا۔ وہ مرد بہشتی علی قلی خاں شش انگشتی کی صاحبزادی اور نواب غفران مآب وزیرالمالک عماد الملک غازی الدین خان بہادر کی محل خاص تھیں ۔ بہت

حسین شوخ مزاج ، شکیلہ ظرافت امتزاج ، تیز ذہن ، زکی الطبع ، خوش فکر ، لطیف الوضع ، حاضر جواب بد یہہ گو ، حسن الخطاب ، کشادہ رو ، بہت صاحب جمال اور امور زیبائی میں بہت دانا اور صاحب کمال تھیں ۔ طبع شعر آشنا ، مزاج نکتہ پیرا ، فکر درست ، تلاش رنگین و چست رکھتی تھیں ۔ کبھی میر سوز سے اصلاح لیتی تھیں اور کبھی محمد رفیع سودا سے ۔"

شیفتہ (۶۵) لکھتے ہیں کہ میر قمر الدین منت سے اصلاح لیتی تھیں۔ غالباً قمر الدین منت سے اصلاح سخن کا سلسلہ اس وقت شروع ہوا ہوگا جب میر سوز اور سودا دہلی سے چلے آئے ہوں گے۔ ۱۱۷۶ ہجری مطابق ۶۳-۱۷۶۲ ع سے ۱۱۸۴ ہجری مطابق ۷۱-۱۷۷۰ ع تک عماد الملک فرخ آباد میں پناہ گزین رہا۔ اس دوران میں بھی سودا اور سوز یہ خدمت سر انجام دیتے رہے ہوں گے۔

عماد الملک فرخ آباد سے نکل کر نواح آگرہ میں پہنچا اور پنجاب کا قصد کیا محمل میں سوار جاتی تھیں۔ پانی مانگا اس وقت آبدار خانے میں بہ حسب پانی نہ تھا۔ آب تازہ چاہ سے کھینچ کر اسے دیا۔ آب اس چاہ کا شور تھا۔ منہ سے جام لگاتے ہی وہ شیریں دہن ، قلق بے مزگی سے جاں بحق ہوئی (۶۶)۔ راستے میں گنا بیگم نے داعی اجل کو لبیک کہا اور آگرے سے ترسٹھ میل کے فاصلے پر بہ سمت جنوب موضع نور پور میں دفن ہوئیں۔ یہ مقام گوالیار سے پندرہ میل جانب شمال ہے۔ قبر پر ایک مختصر سا کتبہ لگا ہوا ہے۔ جس پر یہ مضمون کندہ ہے :۔

" بنو بیگم یکم محرم ، ۱۱۸۷ ہجری مطابق ۲۵ / مارچ ۱۷۷۳ ع "

ولی اللہ تاریخ فرخ آباد میں لکھتے ہیں کہ گنا بیگم نواب عماد الملک کے ہمراہ فرخ آباد میں رہی تھیں۔ (۶۷)

بہارستان ناز میں گنا بیگم کا تخلص شوخ لکھا گیا ہے۔ (۶۸) گنا بیگم کو نوسیری کے نام سے بھی شہرت تھی اس کا جسم لطیف وزن میں نوسیر تھا (۶۹) تذکروں میں ان کے حسن و جمال، خوبی ادا، علم و فضل، عقل و دانش ، حاضر جوابی اور تیز طبعی کے بہت سے واقعات درج ہیں جو لطف سے خالی نہیں ان کے مطالعے سے موصوفہ کی شخصیت بہت دلآویز نظر آتی ہے۔

" ایک دن گنا بیگم اپنے پائیں باغ میں بیٹھی ہوئی گلاب کے پھول کی بہار دیکھ رہی تھیں۔ اتنے میں نواب غازی الدین عماد الملک آگئے بیگم کو اس طرح محو پایا کچھ دیر دیکھا اور اس کے بعد کہا چلو بارہ دری میں چلو بیگم نے کہا چلیے میں ابھی حاضر ہوتی ہوں۔ نواب صاحب یہ

سن کر چلے گئے اور بارہ دری میں مسہری پر آرام فرمانے لگے بہار کی ہوا کی موجیں آنکھوں کو مست و مخمور کیے دیتی تھیں نتیجہ یہ ہوا کہ بیگم جب اندر پہنچیں تو نواب صاحب سو چکے تھے۔ بیگم نواب کو محو راحت دیکھ کر باہر آنے لگیں مگر پاؤں کی آہٹ سے نواب کی آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تو بیگم واپس جا رہی تھیں نواب نے فوراً ایک مصرع موزوں پڑھا :

آکر ہماری نعش پہ کیا یار کر چلے

حاضر جواب بیگم نے فوراً گرہ لگائی :

خواب عدم سے فتنے کو بیدار کر چلے

ایک مرتبہ رات کو بزم عیش منعقد تھی نواب نے شمع کو دیکھ کر یہ شعر پڑھا) :

سر سے پاؤں تک سفیدی آگئی تس پر یہ حال
شمع سی ہم نے نہیں دیکھی کوئی بوڑھی چھنال

بیگم نے نواب کا اعتراض رد کرتے ہوئے کہا :

پردہ فانوس میں رکھتی ہے عصمت کو سنبھال
کاٹ لو اس کی زباں جو شمع کو بولے چھنال

گنا بیگم کے صاحبزادے نصیر الدولہ بیمار تھے۔ عماد الملک نے خیریت دریافت کرائی قضارا اسی دن نصیر الدولہ کا انتقال ہوگیا۔ بیگم نے جواب میں یہ شعر لکھ بھیجا (۱) :

از حال من مپرس کہ دل چاک کردہ ام
لخت جگر بریدہ تہ خاک کردہ ام

گنا بیگم کا کلام اپنی ظاہری اور معنوی خوبیوں کے اعتبار سے بڑا دل کش ہے۔ وہ شعرائے معاصرین کے ساتھ ہم طرح غزلیں کہتی تھیں کہ فارسی کا بڑا پاکیزہ ذوق تھا (۲) ۔

نمونۂ کلام فارسی :

تا کشیدی از نزاکت سرمۂ دنبالہ را — شد عصائے آہوی چشم بیمار ترا
جگر پر سوز، دل پر خوں، گریباں چاک و جاں برلب — قضا را شرم می آید ز سامانے کہ می دارم

نمونۂ کلام اردو :

نامہ لکھا سبھوں کو مرا نام بھی نہیں — اوروں کو تو دعا مجھے دشنام بھی نہیں
ناصحا اٹھ مری بالیں سے کہ دم رکتا ہے — اشک امڈا ہوا پھر ضبط سے کر رکتا ہے

کہتے ہیں اسے ڈوب مرا آج کنویں میں ظالم جو ترا شیفتہ چاہ زقن تھا

نیم بسمل نہ چھوڑ جانا تھا زخم اک اور بھی لگانا تھا

ارے قاصد تو میرا اور کچھ مذکور مت کیجو یہی کہیو کہ اپنے دل سے مجھ کو دور مت کیجو

ہماری خاک پہ جب یار نے گذار کیا دم مسیح بنتے سر سے آشکار کیا

سن لیجیو خط سونپ کے پیغام کو قاصد لے اٹھیو نہ پہلے ہی مرے نام کو قاصد

یا الٰہی یہ کس سے کام پڑا دل تڑپتا ہے صبح و شام پڑا

حسن کا جی ہے ادا تجھ میں میاں سو تو نہیں گل تصویر میں گو رنگ ہوا بو تو نہیں

چل ہوا کھا نہ صبا اس دل دلگیر کو چھوڑ تو مزہ پاوے گی تو غنچہ تصویر کو چھیڑ

شمع کو چہرہ دلدار سے کیا نسبت ہے کیوں کہ ہے یہ رخ خنداں، وہ ہے رونی صورت

ابر چھایا ہے مینھ برستا ہے جلد آجا کہ جی ترستا ہے

شب کو میاں طلب میں تری ہم بھٹک بھٹک جوں حلقہ در پہ رہ گئے ہم سر پٹک پٹک
میری بھی مشت خاک کا ٹک پاس ہے ضرور اے جامہ زیب چلیو نہ دامن جھٹک جھٹک

آیا نہ کبھو خواب میں بھی وصل میسر کیا جانیے کس ساعت بد آنکھ لگی تھی

آکر ہماری نعش پہ کیا یار کر چلے خواب عدم سے فتنے کو بیدار کر چلے
جاتے تو ہو بھرے ہوئے گرد و غبار میں تعمیر کس کے دل کی یہ مسمار کر چلے
خود ہی پیالہ خواہ سبو کیجیو کلال ہم اپنی خاک پر تجھے مختار کر چلے

جس طرح لگی دل کو مرے چاہ کسو کی
اس طرح نہ لگیو مرے اللہ کسو کی

اس زلف دراز اپنی کو ظالم نہ گرہ دے
کیا فائدہ جو عمر ہو کوتاہ کسو کی

نے نامہ نہ پیغام زبانی نہ نشانی
حالت سے کوئی کیوں کہ ہو آگاہ کسو کی

اس کا پیغام مجھے کیوں کہ زبانی آوے
نام سنتے ہی مرا جس کو گرانی آوے

جھوٹ کہتا ہے تو قاصد یہ زبانی پیغام
مجھ کو پاوے نہیں جب تک نہ نشانی آوے

دین و دنیا سے سروکار ہے کس کو کافر
رات دن فکر یہی ہے کہیں جانی آوے

مجھ سے کرتی ہے تری زلف کجی کیا کیجے
دل مرا لے کے یہ کہتی ہے نہ جی کیا کیجے

دیکھنے تیرے بغیر اب تو نہیں رہتی چشم
اس کی تدبیر کہو اب تو اجی کیا کیجے

جی تک بھی اگر چاہو تو وسواس نہیں ہے
کچھ اور جو ڈھونڈھو تو مرے پاس نہیں ہے

کی جس سے محبت وہ ہوا دشمن جانی
کچھ جی کا لگانا ہی مجھے راس نہیں ہے (۳)

اب خواب ہی میں وصل ترا ہووے سو ہووے
ظاہر میں تو ملنے کی ہمیں آس نہیں ہے

یار پردے میں ہے اور عیش سے مایوسی ہے
نقش پا تک بھی مرے در پہ جاسوسی ہے

مدعی اس سے سخن ساز بہ سالوسی ہے
پھر تمنا کو یہاں مژدہ مایوسی ہے

حنا خوں ہو کے ان پاؤں کی جب کچھ بات چلتی ہے
رگڑتی ہے سر اپنا سنگ پر اور ہاتھ ملتی ہے

ترے منہ کی تجلی دیکھ کر کے رات میرے سے
زمیں پر لوٹتی تھی چاندنی اور شمع جلتی تھی

شمع کی طرح کون رو جانے
جس کے جی کو لگی ہو سو جانے

عندلیبوں کو وہ گلزار مبارک ہووے
ہم کو یہ سایۂ دیوار مبارک ہووے

رات دن جس لیے روتی ہو سو اللہ کرے
انکھڑیو ! تم کو یہ دیدار مبارک ہووے

۱۷۔ مدہوش، میر نبی خاں:

تذکرہ میر حسن میں مدہوش کا ذکر اس طرح ملتا ہے :۔

"میر نبی خاں نام تھا اور حضرت خواجہ محمد باسط قدس سرہ کے نواسے تھے۔ خوشنوا جوان اور نیک خو انسان ہیں۔ میر سوز کے شاگرد ہیں اگرچہ ابھی ابتدائے مشق سخن ہے لیکن اگر موقع ملا تو اچھا کلام کہہ سکیں گے۔ فقیر سے بہت دوستی ہے خدا سلامت رکھے (۷۴)۔ قاسم اور شیفتہ نے ان کا نام نہیں لکھا ہے (۷۵)۔ مدہوش صاحب ذوق تھے اور غزل سے خاص مناسبت تھی"۔ (۷۶)

نمونۂ کلام:

مرا جس ناز سے تونے لیا دل خدا جانے ہے اس کو یا مرا دل

۱۸۔ نوازش، نوازش حسین خاں:

نام نوازش حسین خاں تھا اور مرزا خانی کے نام سے مشہور تھے۔ ان کے باپ کا نام نواب حسین علی خاں تھا۔ نواب حسین علی خاں کی شادی نواب قاسم علی خاں عالی جاہ کی دختر سے ہوئی تھی۔ یہ وہی قاسم علی خاں عالی جاہ ہیں جو نواب بنگال تھے اور جنھوں نے شاہ عالم اور شجاع الدولہ کی امداد حاصل کر کے بکسر کے میدان میں انگریزوں کا مقابلہ کیا تھا۔ نجف خاں جو نواب قاسم علی خاں کا سپہ سالار تھا انگریزوں سے مل گیا جس کے باعث متحدہ فوجوں کو شکست ہوئی۔ نواب موصوف کچھ عرصہ فرخ آباد میں رہے اور پھر روہیل کھنڈ چلے گئے۔

نوازش حسین خاں کے باپ نواب حسین علی خاں نواب ناصر خاں کے بیٹے تھے۔ نواب ناصر خاں ۱۱۵۲ ہجری مطابق ۱۷۳۹ ع میں کابل کے صوبہ دار تھے۔ جب نادر شاہ ہندوستان پر حملے کی غرض سے بڑھا تو نواب ناصر خاں نے اس کا راستہ روکا اور محمد شاہ کو مدد کے واسطے لکھا۔ محمد شاہ نے کوئی توجہ نہ کی تاب مقاومت نہ لا کر ناصر خاں ہندوستان چلے آئے اور فرخ آباد میں آکر قیام کیا۔ نواب احمد خاں والی بنگش ان کا بہت احترام کرتے تھے خود ناصر خاں کے مکان پر جاتے تھے۔ جب ناصر خاں کا انتقال ہوا تو احمد خاں کے حکم سے ان کا لڑکا مظفر جنگ مع ارکان دولت جنازے میں شریک ہوا ناصر خاں جب تک زندہ رہے تین ہزار روپیہ ان کو مستقل ادا کیا جاتا رہا۔

ناصر خاں کے دوسرے صاحبزادے نواب محمد قاسم خاں یعنی نوازش حسین خاں کے چچا

شجاع الدولہ کی سرکار میں عدالتی کاموں پر مامور تھے۔ ایک دفعہ نواب شجاع الدولہ نے قاسم خاں سے کہا کہ اپنے والد کو بھی لکھنو بلوا لو میں ان کو اپنا نائب بنا لوں گا۔ قاسم خاں نے اپنے والد نواب ناصر خاں سے کہا کہ اگر آپ لکھنو چلیں تو شجاع الدولہ بہت اعزاز دینے کے لیے تیار ہیں۔ ناصر خاں نے کہا احمد خاں کے تین ہزار تین لاکھ کے برابر ہیں کیوں کہ جب میں احمد کی ملاقات کو جاتا ہوں تو احمد خاں تعظیم کے لیے کھڑے ہوتے ہیں اگر شجاع الدولہ کے ہاں دروازے پر انتظار کرنا پڑا تو موت سے بدتر ہوگا۔ (۷۷)

مصحفی (۷۸) لکھتے ہیں کہ نوازش اکبر آباد میں پیدا ہوئے لکھنو میں پرورش پائی۔ جوان مہذب اخلاق اور خود بین اور خوش اختلاط ہے اٹھارہ سال کی عمر میں موزونیت شعر کا شوق ہوا۔ شعر کہنے اور پڑھنے میں میر سوز کی پیروی کرتے ہیں اور اپنے آپ کو میر سوز کا شاگرد کہتے ہیں۔ پہلا دیوان سوز کے طرز پر کہا ہے اور اب دوسرے دیوان کو بھی مرتب کرلیا ہے۔

شاہ کمال (۷۹) کا قول ہے کہ اپنے استاد کے انداز پر شعر کہتے ہیں اور ان کی یادگار سمجھے جاتے ہیں ان کو فقیر سے بہت الفت و اتحاد ہے۔ شیفتہ کہتے ہیں کہ نوازش صاحب دیوان شاعر ہیں لیکن ساتھ ہی صراحت کرتے ہیں کہ ان کا دیوان میری نظر سے نہیں گذرا۔ وہ اپنا کلام بالکل اپنے استاد کی طرح پڑھتے تھے اور اعضاء کی حرکات و سکنات سے اشعار کی وضاحت بالکل سوز کی طرح کرتے تھے (۸۰)۔ نوازش کے دو شاگرد اردو ادب کے درخشندہ ستارے بنے ایک تو فسانہ عجائب کے مصنف مرزا رجب علی بیگ سرور اور دوسرے دلگیر جو مشہور مرثیہ گو گذرے ہیں (۸۱)۔ مرزا رجب علی بیگ سرور نے نوازش کو یادگار میر سوز کہا ہے۔ فسانہ عجائب میں انھوں نے نوازش کے اشعار جا بجا نقل کیے ہیں۔ اسی کے ساتھ میر سوز کے بھی کافی اشعار لکھے ہیں۔ نوازش کے بارے میں وہ فسانہ عجائب میں لکھتے ہیں :۔

" جس دم نظر فیض اثر سے جناب قبلہ و کعبہ مخدوم و مکرم آغا صاحب قبلہ آغا نوازش حسین خاں صاحب عرف مرزا خانی صاحب کے یہ گذرا بعد اصلاح شاگرد نوازی فرما کر قطعہ تاریخ سے زینت بخشی۔ قطعہ تاریخ :۔

برائے خاطر یاران و احباب سرور این قصہ را جون کرد ایجاد
بچشم سال تاریخش نوازش فلک این گلستان بے خزاں داد

نوازش کی مزید تعریف سرور کے الفاظ میں درج ہے :۔

" بندہ کمترین تلامذہ اور خوشہ چین سخن جناب قبلہ استاد شاگرد نواز معزز و

ممتاز مجمع فضل و کمال نیک سیرت فرخندہ خصال فرد آگاہ دانش آموز و یادگار جناب میر سوز عرفی عصر سعدی زمان رشک انوری و خاقانی نوازش حسین خاں صاحب عرف مرزا خانی تخلص نوازش کا ہے۔ حقیقت حال یہ مقام ہے ریختہ اور روز مرہ اردو کا ان پر اختتام ہے۔ شعر ان کے واسطے اور وہ شعر کی خاطر موضوع ہیں کہنے کے علاوہ پڑھنے کا یہ رنگ ڈھنگ ہے اگر طفل مکتب کا شعر زبان معجز بیان سے ارشاد کریں فیض دہان تاثیر بیاں سے پسند طبع سحبان و دائل ہو فی زمانتا تو کیا سابقین جو موجد کلام کو سن کر کوس لمن الملکی بجاتے تھے ان کے دیوانوں میں دس پانچ شعر تناسب لفظی یا صنائع بدائع کے ہوں گے وہ ان پر نازاں تھے۔ اور متاخرین فخریہ سند گردانتے لہذا جس شخص کو فہم کامل یا اس فن میں مرتبہ کمال حاصل ہو اور طبع بھی عالی ہو آپ کا دیوان بہ چشم انصاف و نظر غور سے دیکھے کوئی غزل نہ ہوگی جو ان کیفیتوں سے خالی ہو۔ ہر مصرع گواہ ہزار صفت، ہر شعر شاہد لاکھ صنعت مطلع سے مقطع تک ہر غزل مرقع کی صورت اکثر اشعار آپ کے تبرکاً و تیمناً بطریق یادگار بندے نے لکھے ہیں جہاں لفظ استاد ہے وہ آپ کا شعر ہے"۔ (۸۲)

نوازش تذکرۂ سراپا سخن کی تصنیف تک حیات رہے (۸۳) اس کے بعد وفات پائی آپ کا نمونۂ کلام یہ ہے:۔

ایک عالم کو آزما دیکھا جس کو دیکھا تو بے وفا دیکھا

حال بد کا شریک دنیا میں نہ برادر نہ آشنا دیکھا

مری چشم خوں بار کے کر حوالے رنگا چاہے گر ارغوانی دوپٹہ

اس تند خو سے میں نے بوسے بہ صد سماجت جب سو پچاس مانگے تب تین چار ٹھہرے

خدا ملے تو ملے آشنا نہیں ملتا کوئی کسی کا نہیں دوست سب کہانی ہے

زبس کہ رہتا ہے آنے کا اس کے دھیان لگا صدائے در پہ ہے در پردہ اپنا کان لگا

کس کی آمد کا تصور یہ بندھا ہے مجھ کو جو مرا دھیان سدا جانب در رہتا ہے

یہ سانس ہے پیکان ہے نشتر ہے کہ دل ہے   کانٹا سا کھٹکتا ہے یہ کیا دیکھیو بر میں

یہ بل کرتا ہے تو نوک مژہ کی آب داری پر   تجھے بھی طنطنہ کتنا ہے اتنی سی کٹاری پر
مجھے رونا نہ اپنے حال پر کس طرح سے آوے   نوازش برق بھی ہنستی ہے میری بے قراری پر

عشق میں ایک خلل ساتھ لگا رہتا ہے   اشک چل نکلے نوازش جو کبھی دل ٹھہرا

وہ گئے دن جو بسر شب ہو ہم آغوشی میں   اب تو کٹتی ہے مری چار پہر آنکھوں میں

حرام نیند کی اقرار وصل جاناں نے   الہٰی کوئی کسی کا امیدوار نہ ہو

ایام وصل میں ہم لپٹے ہیں جیسے اس سے   یوں وصلی کے بھی کاغذ چسپاں بہم نہ ہوں گے

آغاز عشق ہی میں شکوہ بتوں کا اے دل   ٹک صبر کر ابھی تو کیا کیا ستم نہ ہوں گے

نہ باتوں باتوں میں بات نکلی اسی کے شاید بس اپنے ڈر سے
عزیزو جب تک جیا نوازش کسی سے کرتے سخن نہ دیکھا

۱۹۔ ہوش، میر شمس الدین:

میر شمس الدین نام تھا۔ مصحفی کہتے ہیں کہ جوان شیریں زبان ہے۔ میر سوز کی شاگردی پر ناز کرتا ہے۔ (۸۳) لکھنؤ کے رہنے والے تھے اور اچھے اخلاق کے تھے۔ (۸۴)

نمونہ کلام:

یار ہنستا ہے چشم تر کو دیکھ   گریہ ٹک اپنے تو اثر کو دیکھ
دست و پا گم کریں ہیں مو کمراں   نازنیں تیری اس کمر کو دیکھ
تیرے خط کا جواب آیا ہے   ہوش کھول آنکھ نامہ بر کو دیکھ

۱۔ حیات، حیات اللہ:

اصل نام حیات اللہ تھا۔ شوق ان کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں " قصبہ بدایوں کے باشندے ہیں، جوان، قابل، خوش خو، یار باش، عربی اور فارسی میں خاصی استعداد رکھتے ہیں۔ کبھی کبھی ہندی میں ایک دو شعر میر سوز کی طرز میں موزوں کرلیتے ہیں:

راقم الحروف سے پرانے مراسم ہیں۔ حق تعالیٰ خوش و خرم رکھے (۸۵) اردو میں انھوں نے چھے شعر ہی کہے ہیں زیر نظر قطعہ میر سوز کے خاص رنگ میں کہا گیا ہے:

کچھ تو ادھر بھی پھینکنا پیارے کوئی عشوہ ہی آستاں کی خیر
یا کوئی بوسہ فی سبیل اللہ بھیجنا دوست اپنی جاں کی خیر

۲۔ ذکا، مرزا محمد بخش:۔

مرزا محمد بخش ذکا کا ذکر کرتے ہوئے مصحفی کہتے ہیں " جوان خوش تقریر اور مہذب الاخلاق ہیں۔ اپنی طبیعت کی موزونی کے باعث کلام میر سوز کے طرز پر کہتے ہیں۔ اور مرزا خانی نوازش شاگرد میر سوز سے اصلاح لیتے ہیں۔ اپنے استاد کی غیر موجودگی میں کچھ عرصہ شیخ امام بخش ناسخ سے بھی اصلاح لی۔ ان کی عمر تقریبا چالیس سال ہے۔ ان کی بیاض سے سوز کی طرز پر مندرجہ ذیل اشعار انتخاب کیے جاتے ہیں (۸۶)۔

جو ہوا شیفتہ اس کا سو بہت خوب ہوا دل بھی میرا اسی گیسو میں گرفتار ہوا
تندرستی میں تو مجھ سے تجھے پرہیز رہا اب توانائی کہاں جب کہ میں بیمار ہوا
زندگانی سے ذکا اپنی میں آیا ہوں بہ تنگ آہ کیوں مجھ کو خیال دہن یار ہوا

۳۔ سائل، جلیل شاہ:

آپ کا نام جلیل شاہ تھا والد کا نام شاہ پیارے تھا۔ کمن پوار کے رہنے والے تھے۔ جوان صالح، خوش اخلاق اور صاحب درد تھے۔ شاہ بدیع الدین شاہ مدار قدس سرہٗ کے مزار کے خادموں میں سے تھے۔ ان کو فکر رسا، طبع مناسب، ذہن صائب تھا۔ طرز سخن خواجہ میر درد اور میر سوز کے انداز پر تھا۔ (۸۷)

نمونۂ کلام:

یہ رنگ آب تو ہر رنگ میں فنا ہوجاے — اگرچہ غیر بھی ہووے تو آشنا ہوجاے
نہ پاوے آپ کو اپنے ہی ڈھونڈھنے سے آپ — حباب وار یہاں جس کی آنکھ وا ہوجاے
خدا کے واسطے یاں در گذر نہ کر ظالم — مرے برے میں اگر تیرا کچھ بھلا ہوجاے
گذر گنہ سے مرے اے ترا بھلا ہووے — جو میں برا ہوں تو ٹک آپ ہی بھلا ہوجاے
یہ ذکر خیر میں کرتا ہوں جس کا اے سائل — اگر وہ آپ ہی آجائے کیا مزا ہوجاے

گرم خوئی سے تری ہم نہ ٹلے بیٹھ گئے — شمع کی طرح سے جس جا پہ جلے بیٹھ گئے
کس کی الفت نے یہ اتنا ہمیں پابند کیا — یاں سے سو بار اٹھے اٹھ کے چلے بیٹھ گئے
کوئی دم اور نہ آتے تو نہ پاتے ہم کو — ہم تو گھبرا کے چلے تھے پہ بھلے بیٹھ گئے
جس گھڑی بام پہ دیکھا تجھے مثل خورشید — سایہ ساں ہم وہیں دیوار تلے بیٹھ گئے
دھک سے ہو خوف سے تیرا نہ لیا دم نے سانس — مثل نے بے مدد نالہ گلے بیٹھ گئے

میاں خوش رہو کیوں رہو ہو خفا سے — جو کچھ تم سے ہوگا سو ہوگا خدا سے
نہ پوچھا کبھی تونے احوال سائل — مرے یا جیے کوئی تیری بلا سے

۴۔ میر کلوؔ:

میر حسن لکھتے ہیں کہ میر کلو میر درد کے اعزہ میں تھے۔ باصلاحیت جوان علم و عمل سے آراستہ اور صلاحیت سے پر [illegible] دل، منصف، متواضع، مودب، بزرگ، بزرگ زادہ ان کی فکر غایت بلند ہے۔ دیوان [illegible] مرتب کیا ہے۔ اور بیشتر رباعیات بہ طرز میر سوز عمداً کہی ہیں۔ میاں الم کے ساتھ فیض آباد آئے تھے اور وہیں میں ان سے ملا تھا۔ (۸۸) نمونہ کلام دستیاب نہیں ہوا۔

۵۔ مشتاق، عبداللہ خاں:

اصل نام عبداللہ خاں تھا بزرگوں کا وطن کاشان تھا۔ افغانوں کے قبیلے یوسف زئی سے تعلق رکھتے تھے۔ عبداللہ خاں کے دادا کا نام سیف اللہ خاں تھا، اور سیفی تخلص کرتے تھے۔ والد کا نام ابوالحسن خاں تھا وہ بھی شاعر تھے اور تخلص حسن تھا۔

سیف اللہ خاں، بہادر شاہ اول کے استاد تھے۔ عبداللہ خاں کے والد ابوالحسن خاں دولت مند شخص تھے۔ فکر معاش سے بے نیاز اپنے دولت کدے پر وقت گذارتے تھے مصحفی نے جب تذکرۂ ہندی مرتب کیا اس وقت عبداللہ خاں زندہ تھے۔ چناں چہ وہ لکھتے ہیں :۔

" خان مذکور کو حضور معلّی حضرت ظلّ سبحانی شاہ عالم نے مشتاق علی خاں خطاب بخشا ہے اور پانچ صدی منصب اور ذات و جاگیر سے ممتاز فرمایا ہے آج کل شہزادے مرزا فرخندہ بخت کی اتالیقی کے منصب پر مامور ہیں (۸۹) مرزا فرخندہ بخت شاہ عالم کے بیٹے اور مرزا جوان کے چھوٹے بھائی تھے۔ قمر تخلص تھا شوق لکھتے ہیں کہ اجل نے انکو زیادہ مہلت نہ دی۔ (۹۰)

مشتاق علم جفر، علم رمل اور منہی سے بہت لگاؤ رکھتے تھے۔ خط نستعلیق و ثلث و شفیعا میں یگانۂ روزگار تھے، خوش مزاج خوش خلق اور عاشق پیشہ جوان تھے جب تک وہ الہ آباد میں رہے تو شاہ محمد علیم سے کلام پر اصلاح لیتے رہے۔ دہلی آنے کے بعد میر تقی میر سے استفادہ کرنے لگے۔ " (۹۱)

قاسم کہتے ہیں کہ " انھیں سونا بنانے کا خبط ہوگیا تھا۔ اور جڑی بوٹیوں کی تلاش میں جنگلوں اور پہاڑوں میں مارے مارے پھرتے تھے "۔ مشتاق کے کلام پر اظہار خیال کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ " ان کا کلام درد مندی سے لبریز ہے۔ ان کے اشعار عاشقانہ اور پر تاثیر ہوتے ہیں۔ " انھوں نے مشتاق کو سوز کا مقلد اور پیرو کار کہا ہے۔ (۹۲) اور حیرت اور میر تقی میر سے مشورہ سخن کرنے کا ذکر نہیں کیا ہے۔ قاسم نے اپنا تذکرہ ۱۲۲۱ ہجری مطابق ۱۸۰۶ ع میں مکمل کیا وہ لکھتے ہیں کہ مشتاق نے تھوڑے عرصے پہلے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مشتاق کی وفات متذکرہ سال سے کچھ پہلے ہوئی۔ مرنے سے پہلے یہ شعر کہا :

سبھی دوستوں سے ہے رخصت ہماری
دم واپسیں سے ہے رخصت ہماری

نمونۂ کلام:

آہ لاحق عشق کی یہ کیسی بیماری ہوئی — بار ہا نبضیں چھٹیں اکثر غشی طاری ہوئی
دل سنبھل اب دزدی بوسہ کو شب دیگر پہ رکھ — یار چونکا پاسبانوں میں خبرداری ہوئی
کیوں نہ تو بھٹکی پھرے اے خواہش دل میرے بعد — کرچکے ہم عاشقی جو زندگی پیاری ہوئی
تو نہ آیا دیر تک چھاتی پہ دم اٹکا رہا — جان عاشق کی رہا تن سے یہ دشواری ہوئی
بیقراری ، بے کلی ، در پے طپش رہنے لگی — آہ دل دیتے ہی عاید یہ گنہگاری ہوئی
کھینچ تیغ او دشمن جاں [illegible] کرتا ہے کیا — کرچکے ہم عاشقی جب زندگی بھاری ہوئی
کیا کہوں کیا ظلم غفلت سے [illegible] مشتاق رات — جا چکا پہلے [illegible] جب دل تک خبرداری ہوئی

خرد کو [illegible] یا اس کی نگہ [illegible] کو — کیا اک تر [illegible] وارت مرے لشکر کے لشکر کو
پس مردن یہ سنتے ہی کہ تھے دست طلب باہر — کفن میں آہ کس خواہش نے کھینچا تھا سکندر کو
مکدر ناقۂ لیلیٰ چلا آتا ہے صحرا سے — صبا کس نے ستایا آج قیس خاک برسر کو
مسی آلودہ دندان تبسم میں تماشا کر — نہ دیکھا ہو چمکتے گر شب یلدا میں اختر کو

کی ایک نگاہ یاس جو مژگان یار پر — سو برچھیاں چلیں دل امیدوار پر
جی بند ہو نکل بھی گیا تو جھکی رہی — اے چشم آفریں ہے ترے انتظار پر
مشتاق تیرا کشتۂ تیغ فراق ہے — تقریب فاتحہ سے چل اس کے مزار پر

شہید عشق تمہارے کی نعش اٹھتی ہے — بنے تو تم بھی چلو تک نماز کرنے کو

رنگ کیوں سبز ہے مشتاق ترے چہرے کا — کس نے دیکھا ہے تجھے زہر بھری آنکھوں سے

ہر قدم پر اس کے کوچے میں ہے غش آیا مجھے — ناتوانی ہائے یاں تک تونے پٹوایا مجھے

مٹے ہے دم بدم یوں وصل کی تدبیر کا نقشہ — دکھائی دے ہے کچھ بے ڈھ [illegible] نقشہ